کھڑکی تڑاخ سے بند کر دی اور بڑبڑاتے ہوئے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔

"کمبختوں نے جیسے مذاق ہی بنا لیا ہے۔ دن کو آرام کرو نہ رات کو چلے آتے ہیں منہ اٹھا کر — ہونہہ"۔

باہر سے کتنی ہی دیر گڑگڑا کر بولنے کی صدا آتی رہی کبھی دروازہ کھٹکھٹایا جاتا اور کبھی گھنٹی بجتی۔ خدا جانے وہ کب گئے۔ اور ظہیر کو کب نیند نے آ لیا۔

اس واقعے کو کئی ماہ گذر گئے۔

ظہیر کو اپنے کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لئے دوسرے شہر جانا تھا۔ اسٹیشن پر کھڑا وہ گاڑی کا انتظار کر رہا تھا گاڑی کچھ لیٹ ہی تھی۔ وقت گذاری کے لئے اس نے اخبار لے لیا اور پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے اخبار دیکھنے لگے۔

"ماچس ہوگی آپ کے پاس" ایک شریف صورت آدمی نے مہذب انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں" ظہیر نے اس کا سگریٹ اپنے لائٹر سے جلا دیا۔

"شکریہ۔ وہ بولا" آپ کو بھی گاڑی کا انتظار ہے"۔

جی ہاں۔ ظہیر نے جواب دیا۔ اور پھر آستین ہٹا کر گھڑی دیکھی۔ "بیس منٹ لیٹ ہے"۔

"کل بھی لیٹ تھی۔ مجھے بھی اس گاڑی سے جانا ہے"۔

گاڑی کے متعلق دونوں رسمی سی گفتگو کرنے لگے۔

اللہ کے نام پر بابو۔ رسول کے نام پر بتیس روپے دے دو چیتھڑے لٹکائے بالوں کی لٹیں بکھرائے ایک ادھیڑ عمر عورت جس کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں اور چہرے پر میل کی تہوں میں مایوسیوں کے لاشے تڑپ رہے تھے۔ لڑکھڑاتے قدموں سے دونوں ہاتھ پھیلائے ان کے سامنے آ گئی۔

"اللہ کے نام پر بابو۔ رسول کے نام پر بابو بتیس روپے دے دو عورت نے درد بھری آواز میں کہا۔

"بتیس روپے" ظہیر طنزیہ مسکرایا۔

"جاؤ مائی جاؤ" ادھر سامنے ان سے مانگو" دوسرے آدمی نے ملیجی عورت کو دوسری طرف جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بلا حیل و حجت ادھر چلی گئی۔

"واہ صاحب! ظہیر نے خوشدلی سے کہا" بھیک نہ ہوئی ڈاکٹر کی فیس ہو گئی"۔

دوسرے شخص نے ایک گہری آہ بھری اور بولا۔ "ڈاکٹر کی فیس ہی مانگتی ہے جناب"۔

"کیا مطلب" ظہیر کچھ نہ سمجھا۔

"آپ نے اسے پہلے نہیں دیکھا"۔ وہ شخص سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولا۔

"جی نہیں" —— ظہیر نے کہا۔

"پگلی ہے"۔ سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے اس نے کہا۔

وہ تو ظاہر ہی ہے۔ ظہیر نے بھی سگریٹ سلگایا۔

"بیچاری عورت!" اس نے ایک آہ بھری۔

ظہیر کا تجسس بڑھا۔ تو اس شخص نے اس عورت کی دکھ بھری کہانی سنا دی" بیوگی میں اس نے اپنے ایک سال کے بچے کو محنت و مشقت کر کے پالا۔ غریب تھی لیکن شرافت میں ثانی نہ رکھتی تھی۔ بدقسمتی سے بچہ جوان ہو کر پیٹ کی تکلیف میں مبتلا ہو گیا جہاں بن پڑا بیچاری دکھاتی پھری۔ آخری رات جب اس کی حالت بہت خراب ہو گئی تو ڈاکٹر کو بلانے گئی جس نے بتیس روپے فیس کا مطالبہ کیا۔ بیچاری کے پاس بتیس پیسے بھی نہ تھے۔ مامتا کی ماری نے کئی دروازے کھٹکھٹائے لیکن کون دیتا ہے صاحب۔ گھر لوٹی تو بیٹا مر چکا تھا۔ صدمے سے دماغ ہی چل گیا۔ اب ہر ایک سے بتیس روپے مانگتی پھرتی ہے —— آہ بیچاری —— اس —— وہ گاڑی آ گئی"۔

گاڑی رینگتی چلی آ رہی تھی۔ بیان ادھورا چھوڑ کر وہ آدمی لپک کر گاڑی کی طرف بڑھا۔

ظہیر نے سر دونوں ہاتھ سے تھام لیا۔ اس رات کا واقعہ اسکی نظروں میں گھوم گیا۔ اسے ذہنی دھچکا لگا یوں محسوس ہوا جیسے اس بیوہ عورت کے لڑکے کو اس نے قتل کیا ہو —— اور اسے پاگل کر دینے کا ذمہ دار بھی وہی ہو۔

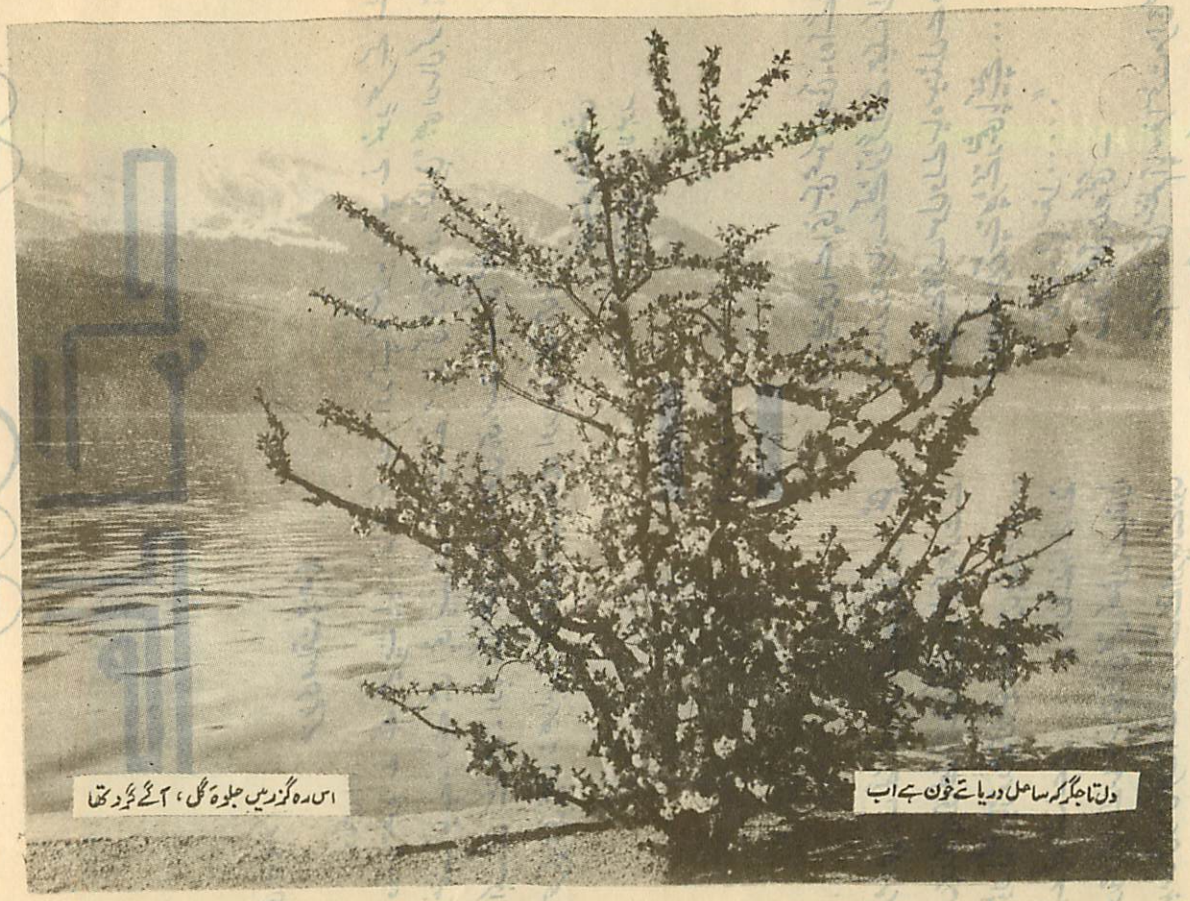
دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خون ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل، آگے گرد تھا

گوری عورت
کالے لوگ

۱۸ر فروری ۱۹۷۱ء

عزیزی صداقت چودھری

دعائیں!

آپ کے دونوں خطوط نے مجھے بخیریت پایا۔ خدا کا شکر ہے۔ اور آپ کا شکریہ۔ آپ نے نمودِ سحر کے لئے "گوری عورت کالے لوگ" کو منتخب کیا ہے۔ ویسے میں اپنی پسند کے دو افسانے "پروا کی موج" اور "شرابی" بھی ارسال کر رہی ہوں۔ آپ ان میں سے کوئی ایک چن سکتے ہیں۔ ادبا کے حلقوں میں دونوں ہی بہت پسند کی گیئں۔

مجھے نمودِ سحر کی کاپی بھیجنا نہ بھولیں۔ لودھی صاحب دعائیں اور پیار کہتے ہیں۔

خیر اندیش

فرخندہ - لاہور

فرخندہ لودھی

"بش ......

صادقہ کے قدم وہیں رک گئے۔ ہمجولیوں کے کہنے پر وہ ذرا ٹھٹکی دوپہر میں چوری چوری کھٹے توڑنے آئی تھی۔ ہاسٹل کی عمارت کے پچھواڑے کھٹوں کی گھنی باڑ کو دیکھ کر لڑکیوں کے منہ میں پانی بھر آتا.... کیسے بڑے بڑے گچھے لٹک رہے ہیں .... یہ باڑ لگانے والے نے خوب سمجھ سوچ کر دیوار کے ساتھ ساتھ لگائی تھی، کھٹوں کے یہ خاردار پودے کسی چور بدمعاش کو اس طرف آنے سے روکتے تھے اور بہار کے دنوں میں پھولوں سے لدے رات دن مست خوشبو بکھیرا کرتے تھے۔ ان کی خوشبو سمجھدار لڑکیوں کو جذباتی طور پر پریشان کیا کرتی۔ پھل لگتا اور چھوٹی لڑکیاں کھا کھا کر جلدی جلدی جوان ہو جاتی تھیں۔

ہاسٹل میں صادقہ سب کی سرغنہ تھی۔ اک 'ہش' سے قدم روک لینے میں اسے اپنی سبکی محسوس ہوئی۔ وہ آگے بڑھی اور دو چار ہاتھ مار کر ڈھیر سارے کھٹے توڑ گرائے۔ جھک کر اٹھا رہی تھی کہ باڑ کے پیچھے سے کارک سول والے سیاہ سینڈل سے دو سپید پاؤں نمودا ہوئے اوپر تڑپتے پھڑکتے ریشمی پائینچے ....

"ہی ہی۔ آپا صغرا ......"

صادقہ کی گھگی بندھ گئی۔

یتیم خانہ کی نئی منتظم آپا صغرا سخت مزاج تھی۔ صادقہ کو اپنی یتیم خانے کی زندگی کے دوران یکے بعد دیگرے چار انچارجوں سے واسطہ پڑا تھا لیکن اس کی شان ہی نرالی تھی۔ بظاہر وہ یتیم خانے کی انچارج قطعاً نہ لگتی تھی۔ کسی اچھے اسکول کی نہ سہی پرائمری اسکول کی ہیڈ مسٹرسوں جیسی آن بان ضرور رکھتی تھی۔ سفید ساٹن کی لش لش

صداقت علی چودھری

گلی کے موڑ پر کافی اندھیرا تھا۔ کارپوریشن کا بلب تو کبھی کبھار ہی جلا کرتا تھا۔ لیکن حکیم اشرف کی دکان کے چھوٹے سے بلب کی ہلکی ہلکی روشنی ساری گلی میں راستہ دکھانے کے لئے کافی تھی۔ ندیم نے کندھوں کے اوپر سے مڑ کر حکیم اشرف کی طرف دیکھا۔ بوڑھے حکیم کی پیشانی پر اس نے غصے کی تمام لکیریں گن لیں۔ ندیم نے کل ہی بازار سے شربت کی ایک بوتل دوستوں کی خاطر تواضع کے لئے خریدی تھی۔ کیونکہ زیادہ تکلفات کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اس نے حکیم اشرف کے پوچھنے پر صاف بتا دیا تھا کہ وہ اس کا بد ذائقہ شربت دوستوں کو پیش کر کے ان کی پھبتیاں نہیں سننا چاہتا۔ حکیم اشرف کو ابھی تک شاید اسی بات کا غصہ تھا۔

گھر کے دروازے پر پہنچ کر وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور آگے بڑھ کر دونوں کواڑوں کی درمیانی جگہ میں سے ہاتھ ڈال کر بینڈا ہٹایا۔ دروازے کے پٹ کھولے تو وہ خود بخود دیوار کے ساتھ جا لگے۔ ٹوٹی ہوئی دیواروں سے مٹی کے پیپڑ زمین پر جا گرے۔

دیئے کی مدھم روشنی میں وہ ہینڈ پمپ کی طرف گیا اور ایک ہاتھ سے پمپ چلا کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔ ہاتھ منہ دھو کر ابھی اٹھا ہی تھا کہ اس کی ماں نے کروٹ بدل کر بے دلی سے پوچھا۔ "کہاں جا رہے ہو دیمی؟"۔

"ابھی تو آیا ہوں"۔ وہ دالان کی طرف مڑا۔

"رات کہاں رہے؟" اُس کے باپ نے مڑے بغیر پوچھا۔

"جہنم میں!" ندیم نے طاق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جہاں پیٹ کا جہنم بھرنے کے لئے اس کا کھانا رکھا ہوتا تھا۔

"کیا کرتے رہے ۔۔۔۔ نوکری ڈھونڈتے رہے ہو؟" اس کے باپ نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"جی" وہ ایسے چونکا جیسے کوئی سکہ دیر تک ہاتھ میں پکڑے

رہنے کے بعد گیلا ہو کر پھسل جائے تو آدمی توجہ دیتا ہے۔

ندیم نے چنگیر میں ڈھکا ہوا کھانا اٹھایا اور اپنی چارپائی پر جا بیٹھا۔

"ملی پھر نوکری؟" اس کا باپ شاید اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہمارے رشتہ داروں میں کوئی بڑی آسامی نہیں ہے ابا۔" اس کے اوپر کے لب کا دایاں کونہ پھڑکا۔

"لیکن رات کہاں گزاری تم نے؟" اس کا باپ اب سنجیدہ تھا۔

"ٹی اسٹور میں ـــــ ایک کپ کے بدلے تمام رات بیٹھنے دیا ہے انہوں نے۔"

"تو نیا بیٹھ کے تصویریں۔ آرٹسٹ نیا پھرتا ہے ـــ آرٹسٹ ـــ مونا لیزا کی تصویریں بناتا ہے۔" اُس کے باپ نے حقارت سے کہا ـــ جیسے تمام قصور اس کے آرٹ کا ہے ـــ حالانکہ وہ فائن آرٹس میں ایم ـ اے کر چکا تھا۔

"یہ آپ بھان متی والا کنبہ کیوں جوڑ رہے ہیں؟" اس کے چہرے پر دکھ اور کرب کے تاثرات ابھرے اور وہ خاموشی سے باپ کا چہرہ تکتا رہا۔

"جا، جا کے سو جا۔ آج بڑے سیٹھ سے میں خود بات کروں گا۔ پڑھا لکھا نہ ہوتا تو مزدوری میں تجھے ایک منٹ میں رکھوا دیتا۔ اب تو کھیر مانگتا ہے اور ملتا ہے دلیا۔"

"باتوں سے کون مانتا ہے۔ بڑے لوگ اول تو چھوٹے لوگوں کی باتیں سننا گوارہ نہیں کرتے۔ اگر سن لیں تو اَن سنی کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے چیئرمین جی کا جواب تو آپ کو یاد ہی ہوگا۔ آپ تو بار بار کہتے تھے میرا لنگوٹیا ہے۔ میرے ساتھ کا کھیلا ہوا ہے۔ لیکن اس نے آپ کو پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔"

"سیٹھ میری بات ضرور مان لے گا۔ سارے مزدور میرے ہاتھ میں ہیں۔ چاہوں تو ایک منٹ میں ہڑتال کروا دوں۔"

"لیکن میں بلیک میلنگ کے ذریعہ نوکری حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ آپ ان سے کہیں کہ وہ میری قابلیت کے مطابق نوکری دے دیں بہتر ہے وہ مجھے ڈیزائننگ کے لئے رکھ لیں۔" اس نے چاولوں کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ چاول نہ کھا،" اس کی ماں نے دخل اندازی کی۔ "پکنے میں کچھ کمی رہ گئی ہے۔ اب تو اینٹ ہو گئے ہوں گے۔ میں تجھے روٹی پکائے دیتی ہوں۔"

"آپ آرام کریں، میں یہی کھا لیتا ہوں۔ خوامخواہ آپ کو تکلیف ہوگی۔"

"کوئی بات نہیں صبح ہونے والی ہے۔" اس نے بڑھ کر کونڈا پکڑا اور رات کے رکھے ہوئے آٹے کو دو چار مکیاں دے کر چولہا جلانے لگی۔

"بھلی مانس ذرا میرا حقہ بھی تازہ کر دینا۔" ندیم کا والد اصل موضوع بھول کر اپنے مطلب کی طرف آیا۔

ندیم کا والد احمد دین مزدور لیڈر تھا۔ فیروز یہ ٹیکسٹائل مل کے مزدور متفقہ طور پر اسے اپنا لیڈر مانتے تھے۔ باقی مزدوران پڑھے اور وہ دو چار جماعتیں پڑھا ہوا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ باتیں بنانا خوب جانتا تھا۔ عاقل خاں کی وفات کے بعد تمام مزدوروں نے اسے اپنا لیڈر تسلیم کر لیا تھا۔ خود تنگی میں رہتے ہوئے بھی اس نے ندیم کو تعلیم دلا دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کچھ بچا نہ سکا تھا۔

ندیم عام نوجوانوں کے مقابلے میں بالکل علیحدہ سوچ رکھتا تھا۔ جس ماحول میں اس نے پرورش پائی تھی اس کا ذرہ برابر بھی اس پر اثر نہ تھا۔ پرکشش انداز گفتگو، خوبصورت خدوخال رکھنے کے باوجود اس کے دوستوں کی تعداد محض اس لئے کم تھی کہ وہ صرف پُرخلوص لوگوں سے ملنے کا عادی تھا۔ اور کھوٹا کھرا پرکھنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اس کا دل آئینے کی طرف صاف تھا۔ خودغرض اور لالچی لوگ اس میں اپنا عکس دیکھنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ اس نے اپنا بہترین ساتھی اپنے اندر ہی ڈھونڈ لیا تھا۔ سوچ اس کا بہترین ساتھی تھی جس کے ساتھ اس کا کبھی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔

لائل پور کے نواحی علاقے میں جہاں ان کا گھر تھا زیادہ تر ملوں کے مزدور یا مزارع اور اسی قسم کے مفلس لوگ رہتے تھے۔ کچے کچے

کرتی شلوار۔ اچھی قطع کی سفید ریشمی قمیض۔ شفون کا سفید دوپٹہ جو اس کے بھاری سینے پر سلیقے سے پھیلا رہتا۔ دھوپ اور سائے سے قطع نظر آنکھوں پر سیاہ چشمے کا پہرہ ہر وقت ہوتا تھا۔ شروع شروع میں صادقہ کا خیال تھا کہ وہ کافی ضرور ہے۔

صادقہ اب تک یتیم خانے میں منہ پھٹ اور ذہین مشہور تھی۔ وہ اپنی ڈھیلی زبان کا چابک اپنے سے بڑوں تک کو لگا دیتی لیکن آپا صغرا سے اس کنی دیتی تھی کیونکہ اس کے پاس گستاخ کی سزا بھی وہی تھی جو کسی چور کی ہو سکتی ہے۔

صغرا کو دیکھا تو صادقہ ہاتھ چھوڑ کر مجرموں کی طرح سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی پیٹھ سنسنا رہی تھی۔ بس رول پڑے ہی پڑے سمجھو، مگر صغرا شور کرتی عمارت کی دوسری طرف نکل گئی۔ جیسے اس نے صادقہ کو دیکھا ہی نہ ہو۔ صادقہ نے اطمینان کی لمبی ٹھنڈی سانس لی اور کھٹے چھولی میں بھر کر ہاسٹل میں گئی تو لڑکیاں اس کے گرد جمع ہو گئیں۔ وہ بیٹھ جانے کے بعد بھی ہانپ رہی تھی۔ کھٹے لاپروائی سے پھینکتے ہوئے بولی۔

"آخری بار کھالو کمبختو۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

لڑکیوں نے چونک کر پوچھا۔

"کیوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"مردارو! آپا صغرا تو مکھی ہے مکھی۔ اس کے چاروں طرف آنکھیں ہیں" لڑکیوں کا تجسس بڑھ رہا تھا اور کھٹوں کی تازہ تازہ خوشبو سے ان کے منہ میں پانی آ رہا تھا۔ صادقہ نے تھوڑی دیر پہلے کا واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر سنایا اور کہا۔

"آج سے سب ہوشیار ہو جائیں۔ کیا خبر کس وقت آفت نازل ہو جائے۔"

آپا صغرا کے آنے سے اسکول کا ڈسپلن پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہو گیا تھا۔ اس کی گوری رنگت اور خوش پوشی کو دیکھ کر کئی لڑکیوں نے اپنے آپ کو اس پر عاشق ہوتے محسوس کیا۔ مگر یہ احساس جلد ہی مٹ گیا۔ کیونکہ وہ کسی کو بھی اہمیت نہ دیتی تھی خواہ کوئی لڑکی کسی وزیر کی سفارش سے یتیم خانے میں آئی ہو یا گورنر کی۔ ہاں صادقہ کو بلا کر کبھی کبھی کوئی کام کہہ دیتی وہ بھی اپنے کمرے کے باہر کھڑے کھڑے۔

صادقہ کو اس کی اس حرکت پر بڑا غصہ آتا۔ وہ ناک بھوں چڑھا کر کام کر دیتی اور دوسروں کو اس کے خلاف اکساتی۔

"بھئی ہم کسی کے غلام نہیں۔ کیا سمجھا ہے؟ پیار سے چاہے جان بھی لے لو۔"

صادقہ نے اپنی شریر آنکھیں گھماتے ہوئے انگوٹھا دانتوں تلے چبایا اور اپنے آپ سے کہا:-

"اوہ اچھا۔ اب سمجھی۔"

صغرا دن کو بھی راؤنڈ لیتی اور رات کو بھی چوکیدار کی جان مصیبت میں تھی۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا۔

اس روز سے تو لڑکیاں بالکل ہی دم سادھ کر وقت گذار رہی تھیں جب دسویں جماعت کی دو طالبات شام ڈھلے برگد کے بوڑھے درخت کی ڈاڑھیوں میں چھپی ایک دوسرے کا منہ چومتے پکڑی گئیں آپا صغرا نے طمانچے مار مار کر ان کے چہرے سجا دیئے اور یتیم خانے کے سرپرست کو رپورٹ بھیجنے کی دھمکی دی۔

یہ یتیم خانہ سیٹھ نصیر نے خاص اپنی جیب سے کھولا تھا۔ خیرات و عطیات بہت بعد میں آنا شروع ہوئے ورنہ تمام اخراجات وہ خود برداشت کرتے تھے۔ سیٹھ صاحب نہایت ثقہ اور پرہیزگار آدمی تھے۔ پہلے دن سے جتنی رقم یتیم خانے کے لئے مقرر کی اس میں اضافہ ہی کرتے رہے۔ عطیات وغیرہ کے سلسلے میں ان کا خیال تھا کہ یہ بچوں کے مقدر سے آتے ہیں۔ انہیں کی بہتری کے لئے خرچ ہونے چاہئیں۔

ان کی عمر کوئی ساٹھ برس کے قریب ہو گی۔ ایک بہت جاہل اور ایک بہت پڑھی لکھی بیوی کے شوہر تھے۔ تیسری منجھلی بیوی جو انہیں بہت پسند تھی بچے کی پیدائش کے دوران انہیں داغ مفارقت دے گئی۔ تو اس کی جدائی کا غم غلط کرنے کے لئے انہوں نے کئی خیراتی اداروں کو دل کھول کر چندہ دیا۔ اور ان ہی دنوں یتیم خانہ بھی کھلا تیسری شادی انہوں نے لوگوں کے کہنے کہلانے سے کر لی کہ پڑھی لکھی عورت روپے پیسے والے گھر میں اتنی ہی ضروری ہے جتنا کسی فرم میں کوئی کوالیفائڈ مینیجر.....

لیکن چھوٹی بیگم کا اپنا المیہ تھا۔ انہیں شروع دن سے سیٹھ صاحب سے کوئی لگاؤ نہ پیدا ہو سکا۔ انہیں اپنے میکے سے زیادہ دلچسپی رہی۔ روشن خیال تھیں مذہبی شوہر سے اکثر ٹکراؤ ہوتا رہتا اور نتیجے کے طور پر وہ بوریا بستر لپیٹ ماں کے گھر چلی جاتی۔ وہاں سے مطالبات کے تقاضے ڈاکٹروں کے بھاری بل، سیر و تفریح کے اخراجات۔ سیٹھ صاحب پورے کرتے تھے۔

روپے پیسے کے معاملے میں سیدھے تھے۔ وہ اندھا دھند خرچ کرتے۔ خدا بے نیازی سے دیئے جاتا۔

جب انہوں نے یتیم خانہ کھولا تو لوگوں کا خیال تھا کہ یہ تو محض ایک بہانہ ہے۔ سیٹھ لاوارث لڑکیوں کو اپنے مصرف میں لایا کریگا مگر کئی سال گذر گئے۔ کوئی ایسا حادثہ پیش نہ آیا۔ لوگ مایوس ہو کر رہ گئے۔

پھر یہ خبر عام تھی کہ یتیم خانہ کی انچارج بدمعاش ہے سیٹھ صاحب کے سیکریٹری کے ساتھ اس کے تعلقات ہیں سیٹھ صاحب کو پتہ چلا تو انہیں بڑا رنج ہوا۔ انہوں نے دونوں کی رائے معلوم کر کے نکاح کرا دیا۔ اللہ اللہ خیر سلاّ۔

دوسری انچارج اپنے خاوند سے ناچاقی کے زمانے میں ملازمت کرتی رہی جیسے ہی خانگی حالات ٹھیک ہوئے استعفیٰ دے کر چلی گئی۔

تیسری ڈھلتی عمر کی عورت تھی۔ نہ معلوم غریب کی بجی زندگی کیسی رہی ہو گی، وہ لڑکیوں کے ساتھ نہایت التفات سے پیش آئی۔ صادقہ تو دن رات اس کے کمرے میں گھسی رہتی تھی۔۔۔ کبھی سر دبا رہی ہے۔ کبھی تیل مالش کر رہی ہے کبھی کپڑے دھو دھو کر، استری کر کر کے دیئے جا رہی ہے۔ ہاسٹل میں اس کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ ہر لڑکی اس سے علیحدگی میں ملنے کی خواہشمند رہتی۔ عذرا ان سب سے بڑھ گئی۔ اس نے چاقو سے آپا کا نام اپنے بازو پر کھود لیا تھا جب زخم میں، مسلسل ڈھکا رہنے سے، پیپ پڑ گئی اور عذرا کو بخار آ گیا تو بات پھیل گئی۔ مایوں، چپڑاسیوں سے ہوتی ہوئی سیٹھ صاحب تک پہنچی۔ اگرچہ انچارج کے خلاف جرم ثابت نہ ہو سکا مگر شک کی بنا پر فارغ کر دی گئیں۔

لڑکیوں نے اس کا نام کالی بلی رکھ دیا تھا جیسے ہی اس کی آمد کا کسی لڑکی کو پتا چلتا وہ "میاؤں" "میاؤں" تمام لڑکیوں کو چوکنا کر دیتی

اب صغرا نے چارج لیا تو وہ سیٹھ صاحب اور لوگوں کی امیدوں پر پورا اترنا چاہتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ محتاط اور الگ تھلگ رہتی۔ وہ راؤنڈ لیتے ہوئے بلی کی طرح دبے پاؤں چلتی۔ لڑکیوں نے اس کا نام "کالی بلی" رکھ دیا تھا۔ جیسے اس کی آمد کا کسی لڑکی کو پتہ چلتا وہ میاؤں میاؤں کی رٹ لگاتی اور باقی لڑکیاں چوکنی ہو جاتیں سخت جاڑے کے چھوٹے چھوٹے دن اور طویل راتیں۔ پڑھائی زوروں پر تھی، بڑی لڑکیاں اپنے اپنے بستر پر بیٹھی انہماک سے مطالعے میں مصروف نظر آتیں، انہیں ان دنوں اسکول سے بہت کام ملتا تھا۔ کرتے کرتے بعض اوقات رات کا تیسرا پہر شروع ہو جاتا۔ اگرچہ پہلا حصہ وہ ہنسی چٹکلوں اور نقلوں، ڈراموں کی نذر کر دیتی تھیں۔

آج کچھ زیادہ دیر ہو گئی وجہ یہ تھی کہ اسکول کا معائنہ ہونے والا تھا لڑکیاں اپنے اپنے پسندیدہ مضمون کے چارٹ تیار کر رہی تھیں تاکہ اسکول کے کمروں کو سجایا جا سکے۔ ایک ایک کر کے لڑکیاں اونگھنے لگیں پھر سو گئیں۔ صادقہ نے ساری بتیاں گل کر دیں۔

رات کے دو بجے کا وقت..... سکوت کا عالم..... کوئی کھڑکی کے پاس سے گذرا۔ یہ چوکیدار ہرگز نہ تھا۔ وہ تو لٹھ بجاتا اعلان کرتا گذرتا تھا۔

"تو یہ جنونی عورت ہے۔ کسی وقت چین نہیں۔ جو اس نے ہماری بتیاں روشن دیکھ لی ہوں تو شامت ہی آجائے گی۔ پوچھے گی تو کہہ دوں گی غسلخانہ جانا تھا۔ یہ کم بخت کو بلڈنگ کے پچھواڑے سے کیا لینا ہے" ۔ صادقہ آہٹ پر کان دھرے آپا صغرا کی واپسی کا انتظار کرتی رہتی۔ کافی دیر گذر گئی۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اٹھی اور ہولے سے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ موسم سرما کی چاندنی ہر طرف بے کار بکھری پڑی تھی۔ گوری چاندنی اور کالے سایوں نے صادقہ کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی، اور اس نے کھڑکی کی سلاخ پر سر رکھے رکھے سوچا۔ جب میرا بیاہ ہو جائے گا تو اپنے شوہر کے ساتھ ضرور سیر کو نکلا کروں گی خواہ گرمی یا سردی۔ وہ کھڑی کھڑی خیالی پلاؤ سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ کھٹے کی باڑ میں سے ایک سایہ نمودار ہوا اور عمارت کے پیچھے چلا گیا۔ صادقہ کی نگاہوں نے جہاں تک تعاقب کیا جا سکتا تھا کیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سایہ جو کوئی بھی ہے اس کی آپا صغرا سے مڈبھیڑ ہوئی سمجھو۔ ابھی تماشہ ہونے ہی والا ہے۔ چوکیدار چلاتا ہوا ایک دو ڈنڈے برسا کر حق ذمہ داری ادا کرے گا اور پھر ایک نیا اور دلچسپ موضوع کئی دنوں تک زبانوں پر رہے گا۔

خاموشی بدستور رہی۔ کوئی آواز نہ آئی تو صادقہ مایوس ہو کر لیٹ گئی صبح آنکھ کھلتے ہی اس نے لڑکیوں کو رات   کا واقعہ سنایا سب لڑکیوں نے کھڑکیاں کھول کر بلا وجہ پچھواڑے جھانکا۔ انہوں نے کتنے دنوں کے بعد ادھر دیکھا تھا۔ کھٹوں کی باڑ ایک دو مقام سے بالکل کٹی ہوئی تھی اور دیوار کے پار سیٹھ صاحب کی کوٹھی کے ستون صاف دکھائی دیتے تھے، پچھواڑے کے گیٹ سے بھی جھاڑیاں جھلپے ہٹا کر صاف کر دیا گیا تھا۔ مالی سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ آپا صغرا کھٹے کے پودے اکھڑوا کر رفتہ رفتہ دوسرے پودے لگوا رہی ہیں تاکہ موسم آنے تک نہ کھٹے لگیں نہ لڑکیوں کے جی للچائیں۔ کھٹا اس ہر لحاظ سے بری چیز ہے۔

اس اطلاع سے سب کو بہت صدمہ ہوا انہوں نے مل کر آپا صغرا کو بد دعائیں دیں۔

"اللہ کرے پیاروں کو پیٹے......"

وقت گذرتا گیا۔ رفتہ رفتہ لڑکیاں صغرا کی سخت گیری کی عادی ہو گئیں وہ اب یتیم خانے کے انتظام کے علاوہ دستکاری سکھانے کی کلاس بھی لینے لگی تھی۔ اس طرح لڑکیوں اور اس کے درمیان فاصلہ قدرے کم ہو گیا تھا، قرآن خوانی اور میلاد کی محفلیں مہینے میں دو تین بار ضرور ہوتیں۔ دسویں جماعت کی لڑکیوں نے امتحان سے فارغ ہو کر دستکاری کی کلاس میں زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ ٹکوزیاں، بیڈ کور، میز پوش اور جانے کیا کیا بنا کر رکھا جا رہا تھا۔ یہ سامان تیار کرنے کے لئے روپیہ کہاں سے آتا تھا، لڑکیاں نہ جانتی تھیں، صغرا ان چیزوں کی نمائش کرنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ نمائش کا افتتاح سیٹھ صاحب سے کرایا جائے اور بہتر کام پر انعامات دیئے جائیں، لیکن سیٹھ صاحب کے اچانک بیمار پڑ جانے نے بات بگاڑ دی۔ لڑکیوں کو ملال ہوا سو ہوا۔ آپا صغرا ہر وقت پریشان رہتی تھیں۔

"لڑکیو اپنے محسن کی تندرستی کے لئے دعا کیا کرو۔"

سیٹھ صاحب کی علالت نے طول کھینچ لیا۔ یتیم خانہ کے شب و روز پرانی ڈگر پر چل رہے تھے۔ گرمیوں کا موسم گذر کر سردیاں آنے والی تھیں۔ بیگمات کے پیغامات ہر روز چلے آتے "قرآن پڑھواؤ۔ آیت کریمہ روز ہونی چاہیئے وغیرہ...."

لڑکیاں دعائیں مانگ مانگ کر اکتا چکی تھیں کہ ایک روز صبح خبر آئی "سیٹھ صاحب چل بسے۔"

کئی لڑکیاں سچ مچ رو دیں اور بعض منہ بسورتی آپا صغرا کے دروازے پر پہنچیں۔ صادقہ نے سب کی طرف سے پوچھا۔

"ہمارے لئے کیا حکم ہے آپا؟"

اس نے پردہ سرکا کر سر باہر نکالا۔

"فی الحال جس جس کے پاس سیاہ دوپٹہ ہو اوڑھ لے"

اتنا کہا اور پردہ چھوڑ دیا۔ آنکھوں پر عینک بدستور تھی۔ اس لئے کسی کیفیت کا اندازہ نہ ہو سکا۔ لڑکیاں صغرا کی اس بے تکی بات پر رائے زنی کرتی ہوئی لوٹ آئیں۔ صادقہ نے تو صاف کہہ دیا۔

"اس عورت کو تو دیوانگی کے دورے پڑتے ہیں"

تھوڑی دیر بعد آپا صغرا سر سے پاؤں تک سیاہ کپڑوں میں ملبوس چلی آ رہی تھی۔ سیاہی میں اس کی گوری رنگت چمک رہی تھی۔

"شکر ہے کوئی رنگ تو بدلا۔ کالا ہی سہی"

صادقہ نے سب کو اطلاع پہنچاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

ادھر سیٹھ صاحب کی کوٹھی پر مسلسل چیخ و پکار ہو رہی تھی۔

لڑکیاں ہاسٹل کے برآمدے میں بیٹھ کر سیپارے پڑھنے لگیں۔ دیوار سے لگ کر بیٹھی آپا صغرا بار بار ناک پونچھتی اور عینک صاف کرتی تھیں۔

جنازہ اٹھنے سے تھوڑی دیر پہلے چھوارے کا گیٹ کھول دیا گیا۔

لڑکیوں کا تجسس بڑھ رہا تھا اور کھٹوں کی تازہ تازہ خوشبو سے اس کے منہ میں پانی آ رہا تھا۔

اور سیٹھ صاحب کا آخری دیدار کرنے کے لئے سارے یتیم خانے کو بلایا گیا۔ عورتوں نے صغرا اور لڑکیوں کو رونی صورت اور سوگوار میں دیکھا تو منہ پر تعریف کرنے لگیں۔

"سمجھدار عورت ہے"

جب وہ مردوں کے پاس سے گذرتی ہوئی واپس آ رہی تھی تو کسی نے کہا۔

"کمال ہے بھئی"۔

دوسرے دن آپا صغرا نے حکمنامہ جاری کیا۔ کہ یتیم خانہ کی لڑکیاں سپید کپڑوں کے ساتھ ہمیشہ سیاہ دوپٹے اوڑھا کریں گی۔ چنانچہ تھوک کے حساب سے دوپٹے رنگوائے گئے، اتفاق سے یہ اسکولوں میں یونیفارم ضروری قرار دیئے جانے کے دن تھے۔

یتیم خانہ کی چھوٹی بڑی سب لڑکیوں کو اس ماتمی لباس پر اعتراض تھا آپا صادقہ کو چنا گیا کہ وہ ان کے احساسات آپا صغرا تک پہنچائے۔ نہ مانی تو وہ بھوک ہڑتال کر دیں گی۔

بھوک ہڑتال کی دھمکی خاصی پیچیدہ اور فیصلہ کن ثابت ہوگی صغرا نے سوچ بچار کے بعد کہا۔

"تم لوگ اپنی شرائط اور خواہشات ایک کاغذ پر لکھ کر نیچے دستخط کر دو۔ یہ چٹھی سیٹھ صاحب کی بیگمات کو پہنچا دی جائے گی۔ جو وہ پسند کریں کیا جائے گا"

صادقہ یہ جواب لے کر لوٹی تو سب کے منہ لٹک گئے۔ وہ ہنسی اڑاتے ہوئے بولی۔

"کمبختو! سمجھ لو سیٹھ صاحب کے مرنے سے تم سب بیوہ ہوگئی ہو اب بیٹھ کر اپنے نصیبوں کو روؤ"

لڑکیوں اور صغرا کے درمیان ایک بار پھر فاصلہ بڑھنے لگا۔ رفتہ رفتہ یتیم خانے کی ہر بشاش لڑکی غمگین دکھائی دینے لگی اور ہر رنگین شئے سیاہ ہونے لگی، حتیٰ کہ ایک روز عمارت کو بھی سیاہ رنگ دیا گیا۔ کہیں کہیں سے پرانی سفیدی جھلکتی تھی اور عمارت یوں دکھائی دیتی جیسے کوئی بیوہ بال بکھیرے راکھ ڈالے بیٹھی ہو۔ لوگ ٹوہ میں رہنے لگے۔ آخر سوگ اور جنون کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

چند ہی دن بعد یہ بات سب کے لبوں پر تھی کہ "آپا صغرا نے سیٹھ صاحب کے ساتھ خفیہ نکاح کر رکھا تھا"

صادقہ نے اپنی شریر آنکھیں گھماتے ہوئے انگوٹھا دانتوں تلے چبایا اور اپنے آپ سے کہا۔

"اوہ - اچھا اب سمجھی"۔

مکانوں میں پلتے بڑھتے اس کی سوچ بڑی پکی ہوگئی تھی۔ بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ اگر کوئی چیز بڑھی تو وہ اس کی سوچ تھی اور اس کا محرک اس کا مشاہدہ تھا۔ اکثر اپنے سوالوں سے باپ کو پریشان کر دیتا۔

فضول لغویات میں اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

محلے کے سارے بچے پتنگ بازی کرتے۔ ٹھمکیاں لگا کر کنکوے چڑھاتے ہوئے بچے اُسے بڑے عجیب لگتے۔ ہاں کبھی کبھی اکھاڑے میں

وہ اس وقت اتنا ھی مغموم نظر آ رھا جتنا کہ ایک بھائی بہن کی خواھش پوری نہ کر کے ھو سکتا ھے

جا کر اس کی طبیعت بہت خوش ہوتی۔ کڑیل جوانوں کو تن سازی میں مصروف دیکھ کر کبھی کبھی اس کو بھی جوش آ جاتا لیکن عملی طور پر وہ کبھی ان میں شریک نہ ہو سکا تھا۔ اس کا دھیان زیادہ تر پہلوانوں کی چستی اور ذہنی مستعدی کی طرف جاتا۔ پسینے اور مٹی نے مل کر اُن کے جسم پر ایک قسم کا لیپ کیا ہوتا۔ لیکن پہلوان گرد و نواح سے بے پرواہ زور آزمائی میں لگے ہوتے۔ کمانوں میں تو اتنا زور نہیں لگاتے تھے لیکن ڈنگلوں میں خون پسینہ ایک کر دیتے۔ اکثر کے ماں باپ اُن سے ناراض رہتے۔ کیونکہ انھیں پہلوانی اور گلی ڈنڈے کے علاوہ کسی چیز سے سروکار نہیں تھا۔

اس کا ایک ہی مشغلہ تھا — آرٹ — آرٹ میں اس کی جان تھی۔

سن شعور کو پہنچتے پہنچتے اس نے اس فن میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ گو کہ اس کے رنگ سستے ہوتے تھے۔ اس کی بنی ہوئی تصویریں اتنی عمدہ ہوتی تھیں کہ کم عمری میں ہی اس نے کئی انعامات جیت لئے لیکن ان انعام یافتہ تصویروں کا ریکارڈ نہیں رکھ سکا تھا کیونکہ اس کی تصویریں کیڑے مکوڑے چاٹ جایا کرتے تھے۔

آج بھی وہ تصویر بنا رہا تھا۔ آج اس نے اتنے شوخ رنگ بھرے تھے کہ ہر رنگ سے خوشی اور امید کی کرنیں نکل رہی تھیں۔

"بارہ بجے تک مل میں پہنچ جانا۔ میں بڑے سیٹھ صاحب سے بات کر چھوڑوں گا۔ اور ہاں ذرا حلیہ ٹھیک کر کے آنا۔" احمد دین نے گھر سے باہر قدم رکھتے ہوئے ندیم کو نصیحت کی۔

"بہت اچھا ابا جان! میں انشاء اللہ ٹھیک وقت پر پہنچ جاؤں گا۔" ندیم نے اپنی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"جاؤ بھی۔ مولوی جی سے مرغی ذبح کروا لا۔" ندیم کی امی نے کہا۔

"مرغی تو میں خود بھی ذبح کر سکتا ہوں لیکن یہ عیاشی آخر کس خوشی میں کی جا رہی ہے۔"

"خوشی تو کوئی نہیں بس۔۔۔"

"تو کیا کوئی بیمار ہے؟"

"نہیں تو۔ بس ننھی ضد کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی رضیہ کے گھر روز مرغی پکتی ہے۔"

"تو اسے بتا دیا ہوتا کہ ہمارے ہاتھ اتنے لمبے نہیں ہیں۔ وہ بھی اپنی خواہشات کو اتنا نہ بڑھائے۔"

وہ اس وقت اتنا ہی مغموم نظر آ رہا تھا جتنا کہ ایک بھائی بہن کی خواہش پوری نہ کر کے ہو سکتا ہے۔ "ایسا کریں آج اُسے پکوڑے تل دیں خوش ہو جائے گی۔ مرغی کی تو کوئی بات نہیں لیکن اس طرح خواہ مخواہ اُس کی عادت بگڑے گی۔"

"جاؤ پھر بازار سے تیل لا دو۔"

کولہو کی طرف جاتے ہوئے اس کے قدم اعتماد سے اُٹھ رہے تھے۔

ماچھا تیلی کولہو میں ایک گھانی ڈال کر بیلی سے گاہکوں کے چھاؤں

میں تیل ڈال رہا تھا۔ ندیم پہنچا تو نیچے صرف گاد رہ گئی تھی۔ ندیم اگلی گھانی کے تیل کا انتظار کرنے لگا۔ سامنے موجو تھابی اور چاک پر بیٹھا دھڑا دھڑ برتن تیار کر رہا تھا۔ گاہک پچھلے گھڑے کے کچے ہونے کی شکایت کر رہا تھا۔ موجو کے پاس وہی پرانی دلیل تھی کہ ۔۔۔

" او پانڈے تے اندروں سپورے رہ گئے سن اے تے جویں اٹ نے۔"

ندیم واپس آیا تو اس کی ماں موکھے سے ہمسائی کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ ان کے گاؤں میں "سفارتی تعلقات" استوار کرنے کے لئے اس قسم کے موکھے بڑا اہم کردار ادا کرتے تھے۔

"ماں جی۔ تیل سے آیا ہوں۔ بالکل تازہ ہے کولہو کا۔"

اس نے ماں کو اطلاع دی۔

پکوڑوں کا ایک گھان کڑھائی میں ڈال کر وہ پھر ہمسائی سے باتیں کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد پکوڑے پک کر خستہ اور سرخ ہو گئے تھے ندیم نے ایک گرم گرم پکوڑا منہ میں رکھا اور کپڑے بدلنے کمرے میں چلا گیا۔

تیار ہو کر باہر آیا تو زمین پر پڑے ہوئے مٹی کے ڈھیر نظر آئے۔

"ماں جی! ان دیواروں کو کیا ہو گیا ہے۔ مٹی ان پر ٹکتی ہی نہیں۔"

" موئے موسم ٹکنے کب دیتے ہیں۔ برسات میں دیواروں کو لونی لگ جاتی ہے اور گرمیوں میں سیوناس ماری دیواروں کو لیپ کر کر کے تھک گئی ہوں۔"

" ڈھب کی نوکری مل جائے تو سب کام سدھر جائیں۔"

" تھوڑی دیر بعد وہ بس اسٹاپ کی طرف جا رہا تھا۔

"آج نوکری ضرور مل جائے گی۔" اسے جیسے پختہ یقین تھا۔

کرگھوں پر جولاہے کھٹا کھٹ اپنے کام میں مصروف تھے۔ گھاٹ پر دھوبی کپڑوں کو پیڑوں پر پٹک پٹک کر ان کا بیڑا کر رہے تھے لیکن وہ ہر چیز سے بے نیاز بس اسٹاپ کی طرف تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔

بس میں بیٹھا ہوا وہ مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کالجوں کے کچھ طالب علم دیر سے کاروں کے مختلف ماڈلوں اور قسموں پر بحث کر رہے تھے۔

" ٹویوٹا کا نیا ماڈل تو لاجواب ہے۔" ان میں سے ایک کی رائے تھی۔

" مجھے تو پرانا ماڈل اچھا لگتا ہے نئے کی تو شکل ہی بگڑی ہوئی ہے۔" دوسرے نے خواہ مخواہ اعتراض کیا۔

" بھئی ہمیں تو مرسڈیز کے علاوہ کوئی کار ہی پسند نہیں۔" ایک نے بات ہی ختم کر دی۔

وہ سب اس طرح رائے زنی کر رہے تھے۔ جیسے سیدھے شو روم کی طرف جا رہے ہوں۔

بس میں بیٹھے ہوئے ان نوجوانوں کی گفتگو سے وہ بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ خواب دیکھنے والے یہ نوجوان اسے بہت بھولے نظر آ رہے تھے۔

بڑا سیٹھ آج اچھے موڈ میں تھا۔ مزدوروں کے مسائل کے علاوہ

آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر ہو گیا۔ آنسو خوشی کے ہوں تو چہرے کو کتنا نور بخشتے ہیں

وہ احمد دین سے ہر موضوع پر بڑے اخلاق سے باتیں کر رہا تھا کیونکہ وہ عاقل خاں کی طرح مزدوروں کے مفاد کے خلاف کبھی نہ بکا تھا۔

تین سو روپے ماہوار کی نوکری سر دست اس کے لئے کافی خوشی کی بات تھی۔ ترقی کا انحصار اس کے کام پر تھا۔ ڈیزائنر کا عہدہ بھی معمولی نہ تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے ماں کو آوازیں دیں۔ ماں کو دیکھتے ہی وہ قدموں میں گر گیا۔

" ماں مجھے نوکری مل گئی۔"

آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر ہو گیا۔ آنسو خوشی کے ہوں تو چہرے کو کتنا نور بخشتے ہیں۔ جیسے تر و تازہ پھولوں پر شبنم

کے قطرے۔

"میں نہ کہتا تھا مجھے میرا حق مل کر رہے گا۔ اب ہمارے دکھ کٹ جائیں گے۔" اسے اپنے بڑے بڑے دکھ بونے نظر آرہے تھے۔

"خدا نے آخر ہماری سُن لی"، شدت جذبات سے ماں کے بھی آنسو نکل آئے۔

"ماں کی دعائیں ساتھ ہوں تو کامیابی کی راہیں کھل جاتی ہیں"۔

"اب رزق حلال کمانا ورنہ تیرا میرا ساتھ ٹوٹ جائے گا"۔

"میں آپ کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا"۔

ماں نے اپنے دوپٹہ کے پلّو میں اس کے آنسو جذب کر لئے۔

مطلع بالکل صاف تھا۔

پھر کچھ دن بعد ننھی کی مرغی والی خواہش بھی پوری ہوگئی۔ اور بس میں رش دیکھ کر کبھی کبھی وہ رکشے میں بھی گھر واپس آجایا کرتا۔ جمعرات کو مولوی کے ہاں روٹی بھی جانے لگی۔

حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ وہ اب مل کا چیف آرٹسٹ ہوگیا تھا۔ بالآخر وہ گاؤں سے شہر منتقل ہوگئے۔ اس کے بنائے ہوئے ڈیزائن خاص و عام میں مقبول ہوئے۔ دوسری ملوں والوں نے کھینچا تانی شروع کردی۔ لیکن اُس نے مل کو لالچ کے تحت نہ چھوڑنے کا تہیہ کرلیا۔ بڑے سیٹھ نے اس کی تنخواہ سات سو سے ایک دم ہزار کرنا چاہی تو وہ نہ رہ سکا۔

"سیٹھ صاحب! اگر آپ میری تنخواہ میرا حق سمجھ کر بڑھا رہے ہیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ ورنہ۔۔۔"

"مجھے آپ سے یہی توقع تھی۔ میں آپ کے کام سے بہت مطمئن ہوں"۔

اگلے دن وہ اپنے کام میں مصروف تھا کہ اس کے کانوں میں ایک نسوانی آواز پڑی۔

"اچھا تو آپ ہیں ہماری مل کے چیف آرٹسٹ؟" بڑے سیٹھ کی بیٹی پروین نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سوال کیا۔ وہ الٹرا ماڈرن لڑکی تھی۔ جھجک نام کو نہ تھی۔

"جی"، اُس نے بدستور پنسل چلاتے ہوئے جواب دیا۔ لڑکیوں کے سامنے اس نے کبھی آنکھیں اٹھا کر بات نہ کی تھی۔

"بہت خوبصورت ڈیزائن بناتے ہیں آپ"۔

"جی شکریہ"، اس نے نظریں اٹھا کر پروین کی طرف دیکھا۔ اور دوبارہ کام میں مصروف ہوگیا۔

"میں نے جو سوٹ پہن رکھا ہے اس کا ڈیزائن بھی آپ کا تیار کردہ ہے"؟

"جی ہاں"، اس نے اپنا ڈیزائن پہلی نظر میں پہچان لیا تھا۔

"بہت خوبصورت ڈیزائن بناتے ہیں آپ"۔

"یہ تو آپ پہلے بھی کہہ چکی ہیں"۔

"جی ــــ جی ہاں"۔

"آپ بوکھلا کیوں گئیں؟"

"بڑے بوآدمی معلوم ہوتے ہیں آپ؟" پروین بوکھلا گئی۔

"ذاتی نوعیت کا سوال"۔

"ہر خوبصورت لڑکا مغرور ہوتا ہے"۔

"آپ سے مطلب؟"

"آدمی کو اتنا مغرور بھی نہیں ہونا چاہئے"۔ وہ بل کھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔

"سر! یہ مل مالک کی لڑکی ہیں"۔ اس کی اسسٹنٹ نے بتایا۔

"ہوں ــــ" اس نے اہمیت نہ دی۔

رات کو بستر پر لیٹی وہ دیر تک سوچتی رہی کہ ندیم بھی کیسا لڑکا ہے۔ لوگ میری ایک نظر کو ترستے اور اس نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ کچھ مرعوب سی ہوگئی۔ لیکن ندیم صبح کے واقعے کو بھول چکا تھا۔ ایسے واقعات اس کے ساتھ اکثر پیش آتے تھے۔ ماڈرن لڑکیوں کو نیچا دکھا کر اس کے کسی جذبہ کو تسکین ہوتی تھی۔ ورنہ کسی کا دل توڑنا تو اس کے نزدیک گناہِ کبیرہ تھا۔ لیکن ماڈرن دل وہ بہت خوشی سے توڑا کرتا تھا۔ اسی لئے آج وہ بہت مسرور نظر آرہا تھا۔

دو تین روز بعد بلاوجہ ہی وہ مل دیکھنے آگئی۔ اور پھر خود ہی اس کے قدم ندیم کے کمرے کی طرف کھنچ گئے۔

"اوہ - ہلو - ہینڈسم" اس نے ندیم کو دیکھتے ہی ایسے کہا جیسے عرصے سے جان پہچان ہو۔

"ایک دم سے بے تکلفی اچھی نہیں ہوتی۔"

"لیکن ہنس کر بات کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔"

"ہوں ---- اوں --- ہوں۔" وہ کام میں مصروف تھا۔

"آپ جذبوں سے نا آشنا ہیں۔"

"اور آپ بہت جذباتی ہیں۔"

"جذباتی عمر میں غیر جذباتی باتیں مجھے بالکل ٹچ نہیں کرتیں۔"

وہ اس سے بالکل مرعوب نہ تھا حتیٰ کہ جنسی نقطۂ نظر سے بھی نہیں۔

اس نے اتنی اکڑو والا لڑکا آج تک نہ دیکھا تھا۔ سامنے سے اس کی اسسٹنٹ ماریا چلی آ رہی تھی۔ پروین ماریا کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتی ہوئی گزری جیسے مقابلۂ حسن منعقد کر رہی ہو۔

اس رات بھی وہ کافی دیر تک ندیم کے متعلق سوچتی رہی۔ کیونکہ اتنی دیر میں شاید اپنا کام کر چکا تھا۔

اور پھر اگلے دن سیٹھ صاحب نے اسے بلا بھیجا۔ وہ ہر قسم کے حالات کے لئے تیار ہو کر گیا تھا۔ لیکن خلاف توقع سیٹھ صاحب نے اپنی بیٹی کو آرٹ سکھانے کے لئے کہا۔

"جی میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"

"تمہیں اس کا معقول معاوضہ ملے گا۔"

"میرا مطلب پیسوں سے نہیں تھا --- میں آپ کی بات مانے لیتا ہوں۔"

"ہلو! ندیم۔ میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔" پروین نے کمرے سے نکل کر ندیم کو دیکھتے ہی کہا۔

"السلام علیکم" ندیم ہلو کی بجائے سلام ہی کیا کرتا تھا۔ لیکن عجیب اتفاق تھا کہ پروین نے سلام کا جواب نہ دیا اور ندیم نے ہلو کا۔ یہ شاید جدید اور قدیم تہذیب کی REPULSION تھی۔ جسے سب ہی مٹانا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کا ملاپ نہ کبھی ہوا ہے نہ ایسا ممکن ہے۔

"جاؤ بیٹی۔ ندیم صاحب کے لئے چائے بنا لاؤ۔"

"جی شکریہ۔ میں چائے نہیں پیا کرتا۔"

"اچھا تو کوک منگوائے لیتے ہیں۔"

"جی تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے سرے سے پیاس ہی نہیں ہے۔ آپ اپنا سامان لائیں اور کام شروع کریں۔"

"جی نہیں! آج تو صرف تعارف ہی ہوگا۔"

ندیم بے بس تھا۔

اگلے دن سے ندیم نے پروین کو آرٹ سکھانا شروع کیا۔ پروین نے اشاروں ہی اشاروں میں دل کی بات سمجھانے کی کوشش کی لیکن ندیم سمجھتے ہوئے بھی انجان بنا رہا۔

"آپ بہت سرد مزاج ہیں۔"

"یہ صرف آپ کی رائے ہے۔ میرے دوست اس سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔"

"تو آپ ہمیں دوست نہیں سمجھتے۔"

"لڑکی لڑکے کی دوستی۔ کیا معنے؟"

"آپ بہت پرانے خیالات کے مالک ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"اوہ - آپ جذبات کو نہیں سمجھتے۔"

"جی ہاں۔ میں پیدائشی بے سمجھ ہوں۔"

پھر ایک دن پروین نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "کل میری سالگرہ ہے۔ آئیے گا آپ بھی۔"

"جی میرے پاس اتنا وقت نہیں۔"

"تحفے سے بچنے کا بہانا آپ نے اچھا بنایا ہے۔"

اور وہ لاجواب ہو گیا۔

"اوہ - ندیم! آپ نے بہت دیر کی۔"

"جی میں تو وقت پر آ گیا ہوں۔"

وہ نہیں جانتا تھا کہ کسی کا انتظار ہو تو دیری خواہ مخواہ محسوس

ہوتی ہے۔

"آیئے۔ لیکن آج کوئی ایسی بات نہ کیجئے گا کہ میرا موڈ خراب ہو جائے۔"

"میری تو ہر وقت خواہش ہوتی ہے کہ میری وجہ سے کسی کا دل نہ ٹوٹے۔"

"سچ ندیم" وہ خواہ مخواہ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی۔

ندیم اپنے تئیں مطمئن ہو گیا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ دل ٹوٹتے پتا ہی کب چلتا ہے۔

لان کو برقی قمقموں سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ درمیان میں ایک بڑی سی میز پر کیک رکھا تھا۔ شریک محفل زرق برق لباسوں میں نرم اور گداز صوفوں پر بیٹھے تھے۔ کیک کٹا۔ سب لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ محفل کا آغاز بڑی گرمجوشی سے ہوا۔ تھوڑی دیر بعد جام سے جام ٹکرانے شروع ہو گئے۔ محفل اپنے شباب پر تھی۔

ماڈرن اور بڑے لوگ وہی غلطیاں اس وقت سرِ عام کر رہے تھے جو غریب چھپ چھپ کر کرتے ہیں۔ چھوٹے لوگوں کی غلطیاں بھی چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں اور خواہشات بھی اور بڑے لوگ تو ہر چیز بڑے پیمانے پر کرتے ہیں۔

میوزک کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ جب میاں بیوی آپس میں بات کرتے ہیں تو آہستہ آہستہ تاکہ کوئی سن نہ لے۔ اور جب کسی کی بیوی کسی کے شوہر سے بات کرتی ہے تو اونچی آواز میں تاکہ محفل باخبر رہے۔ لیکن یہاں ہر کوئی ایک دوسرے سے بے نیاز تھا اور میوزک سچا رازدار۔ اور ڈانس کا ڈرل ماسٹر بھی۔

ندیم کے قریب ہی ایک جوڑا ڈانس کرنے کے بعد واپس آ کر بیٹھا تھا۔ دونوں آپس میں تلخی سے باتیں کر رہے تھے۔ میاں کو شکایت تھی کہ بیگم خواہ مخواہ دوسرے صاحب کے ساتھ کیوں چمٹ چمٹ کر ڈانس کر رہی تھیں اور بیگم کو میاں صاحب کی اسی حرکت پر اعتراض تھا۔

اسے یوں لگا جیسے وہ جوڑا متوسط طبقے کے ایسے گروہ سے تعلق رکھتا ہے جو ایسی تقاریب میں آ کر چھپتاتے ہیں لیکن بار بار چھپتانے میں نجانے انھیں کیا لطف آتا ہے حالانکہ اس میں "انا" بھی مجروح ہوتی ہے اور احساس بھی۔

ابھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ دوسرا راؤنڈ شروع ہو گیا۔

اس کا والد تقریر کر رہا تھا۔ مزدوروں کے ٹھٹھے کے ٹھٹھے لگے تھے۔

"آؤ ندیم۔ ہو جائے ایک راؤنڈ" پروین نے ندیم سے کہا۔

گناہ کی کھلی دعوت۔ ندیم بوکھلا گیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ان لوگوں سے کم تر ہے۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ کوٹھی کا گیٹ پار کر گیا۔

رات کو پروین نے سب سے پہلے ندیم کا تحفہ کھولا۔

"اپنی شاگرد کے نام"

فقط ندیم

"شاگرد" اسے اس لفظ پر بڑی ہنسی آئی۔

"کس پتھر سے سر ٹکرایا ہے تم نے بھی"۔ پروین نے اپنے آپ سے کہا۔ "کس طرح اس کو اپنے دل سے نکالوں۔

"لیکن دل میں چھپے ہوئے تیروں کو نکالتے ہوئے تکلیف بہت ہوتی ہے" دور کہیں خلا سے آواز آئی۔

وہ دوسرے تحفے دیکھے بغیر ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

اگلے دن ندیم حسب معمول آرٹ سکھانے چلا آیا۔

"میں خواہ مخواہ اس کنارے کو چھونے کی کوشش کیوں کروں جو مجھ سے بہت دور ہے" یہ ندیم کا شروع سے نکتہ نظر تھا۔

"اپنے آپ کو ندیم کے سامنے جھکا کر میں اپنی انا کو ٹھیس کیوں پہنچاؤں" پروین اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔

آج پہلی دفعہ پروین اس کے ساتھ شاگردوں کی طرح پیش آئی تھی۔ واپسی پر برآمدے میں چلتے ہوئے وہ مطمئن تھا۔

وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

"جی آپ نے یاد کیا۔ بندہ حاضر ہوگیا۔" برآمدے سے گزرتے ہوئے اس نے اپنے والد کی آواز سنی۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ شیشے سے اندر جھانکا۔ اس کے والد سیٹھ صاحب کے سامنے بیٹھے تھے۔

"مل مالک اور مزدور لیڈر کی ملاقات۔ کیا مطلب؟" وہ بڑبڑایا۔

"اوہ۔ بھئی میں نے تمہیں تکلیف اس لئے دی تھی کہ آج کل کپڑے کا سٹاک بہت بڑھ گیا ہے۔ بازار میں کھپت کوئی نہیں۔ مندی کا رجحان ہے۔ اور۔"

"کچھ دن کے لئے ہڑتال ہو جائے تو معاملہ برابر ہو جائے گا۔ ہمیں بھی نقصان نہ ہوگا اور تمہیں بھی فائدہ ہو جائے گا۔ ویسے بھی اگر مزدور لیڈر ہڑتال نہ کرائے تو اسے لیڈر کون مانتا ہے۔ پھر بھی تمہارا حصہ تمہیں مل جائے گا۔"

"میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔" اس نے منمناتے ہوئے کہا مینجر اسے پہلے ہی راضی کر چکا ہے۔

ندیم سکتے میں آگیا۔ "تو میرا باپ بک گیا۔" اس سے اپنی آواز بھی پہچانی نہ جا رہی تھی۔

لڑکھڑاتے قدموں سے وہ کوٹھی سے باہر نکلا۔

"نہیں ماں جی۔ میں کھا چکا ہوں۔"

اس کے سوچنے کی قوت مفلوج ہو چکی تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بستر پر گر پڑا۔

پھر اس نے ایک منظر دیکھا۔

اس کا والد تقریر کر رہا تھا۔ مزدوروں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے۔

"میرے مزدور بھائیو! آج تم سب کو ایک ظالم سرمایہ دار کے خلاف متحد دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہو رہی ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم آگے بڑھیں اور اپنا حق چھین لیں۔ مجھے اس کپڑے میں سے تمہارے خون کی خوشبو آرہی ہے۔ ہم اپنے مقصد کے لئے آگے بڑھتے جائیں گے۔ چاہے ہمیں اپنے خون کی قربانی دینا پڑے۔ ظالم سرمایہ داروں نے برسوں سے ہمارا حق غصب کر رکھا ہے۔ عیاشی ان کی ضرورت ہے۔ دو وقت کا کھانا ہماری عیاشی۔ آج سے تم میں سے کوئی کام پر نہیں جائے گا۔ جب تک ہمارے مطالبات پورے نہیں ہوتے ہم مکمل ہڑتال رکھیں گے۔ یاد رکھو ساتھیو۔"

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔" ندیم سوتے میں بڑبڑا رہا تھا۔

"ہم اپنے مفادات کے خلاف کوئی سمجھوتا قبول نہیں کریں گے۔ کسی قسم کی رخنہ اندازی برداشت نہیں کی جائے گی۔"

یہ عجیب اتفاق تھا کہ پروین نے سلام کا جواب نہ دیا اور ندیم نے "ہلو" کا۔ یہ شاید جدید اور قدیم تہذیب کی REPULSION تھی جسے سب ہی مٹانا چاہتے تھے۔ لیکن ایسا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ایسا ممکن ہے

"روٹی نہیں کھاؤ گے ندیم؟" اس کی ماں نے اسے اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر کہا۔

"نہیں۔ نہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

"تم کون ہوتے ہو اس معاملے میں آنے والے؟"

اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس کی گردن زور سے دبا

رہا ہو۔

درد سے ایک دم اس کی آنکھ کھلی۔ اس کا چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔

"میں مزدوروں کو بتا دوں گا کہ ان کا لیڈر مر چکا ہے۔"

سوچوں کے بہاؤ میں بہتا ہوا وہ دور نکل گیا۔

پھر وہ پُرسکون تھا۔

جسے وہ آج اپنا سمجھتا رہا تھا۔ وہ کل میں بدل گیا تھا۔ آنے والے دن اس کے لئے بالکل نئے تھے۔

اور سورج کی کرنیں تمام زمین پر پھیلنے لگیں۔

اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ندیم کو سوتا دیکھ کر اس کی ماں لائٹ آف کرنے بڑھی۔ آہستگی سے آنکھیں کھول ندیم نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"روشنی رہنے دو۔ ماں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ آئینے کے سامنے کھڑا ٹائی باندھ رہا تھا۔

مزدور لیڈر

غریب کون؟

ایک مزدور ایک بڑے صنعت کار کے پاس آیا اور بولا:

"جناب والا! میں آپ سے ایک سوال کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

"کیا سوال ہے وہ؟" صنعت کار نے بڑی حیرانی سے پوچھا۔

"عالی جاہ! آپ کو دنیا کی ہر سہولت حاصل ہے۔ لذیذ سے لذیذ اور عمدہ کھانے، اعلیٰ سے اعلیٰ شراب، حسین سے حسین عورتیں لیکن اس کے باوجود آپ خوش نہیں ہیں۔ آپ کو بھوک نہیں لگتی۔ رات کو آپ خواب آور گولیاں کھا کر سوتے ہیں۔ آپ کو خون کے دباؤ کی شکایت ہے اور کسی نے آپ کو کبھی خوش نہیں دیکھا۔ میں ایک معمولی سا انسان ہوں۔ لیکن دال روٹی میں مجھے وہ لطف حاصل ہوتا ہے جو آپ کو قیامت تک نہایت عمدہ اور اعلیٰ کھانوں سے حاصل نہ ہو سکے گا۔ بیڑی کے ایک کش سے مجھے وہ نشہ آتا ہے جو آپ کو وہسکی کی پوری بوتل سے بھی نہیں آتا۔ مجھے اپنی بیوی کی محبت سے جو راحت ملتی ہے وہ آپ کو دنیا کی ایک ہزار حسین ترین عورتوں کے دم سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ میں رات کو چین اور سکون کی نیند سوتا ہوں۔ براہِ کرم مجھے یہ بتا دیجئے کہ "دولت" میرے پاس ہے یا آپ کے پاس؟ غریب میں ہوں یا آپ؟"

مبارک باد

بمبئی میں مزدوروں نے جلوس نکالا۔ جلوس کو منتشر کرنے کے لئے پولیس نے لاٹھی چارج کیا، آنسو گیس استعمال کی اور پھر آخر کار اسے گولی چلانی پڑی۔

مزدور لیڈر زخمی ہو کر ہسپتال پہنچا۔ سارا دن اس کے دوست اور رشتے دار عیادت کو آتے رہے۔ شام کو اس کا ایک دوست جو پولیس میں ملازم تھا، وہاں آیا اور اس نے مزدور لیڈر کو بڑی گرم جوشی سے مبارک باد پیش کی۔

"مبارک باد؟" ــــ مزدور لیڈر نے حیران ہو کر پوچھا "بھئی، مبارک باد کس بات کی؟"

پولیس والے نے سنجیدگی سے کہا: "یہی کہ گولی تمہاری ٹانگ میں لگی ہے، سر میں نہیں لگی۔"

پسند اپنی اپنی

میری ڈائری

آج کل ہر بوڑھا چاہ رہا ہے کہ
بہتر بکری اچھا ممیانے والی ہو۔
ایک ہی باڑے کی نہ ہو رہے۔ بلکہ ہر
طرف گھلتی ملتی رہے۔ سو وقت کی
طلب کے مطابق ماڈرن بکریاں خوب
سدھ کے آتی ہیں۔ آپ بھی......

ڈاکٹر مظفر اقبال چغتائی

بچپن میں ہم کبھی ملے تھے۔ کھیلے بھی ہوں گے۔ مل کر ہنسے اور روئے بھی ہوں گے اور کبھی نہ کبھی لڑے بھی ہوں گے۔ مگر اب یہ خواب حافظے کی گہرائی میں اتر کر تہ نشین ہوگیا ہے کوشش کرنے کے باوجود کچھ یاد نہیں آتا۔ ممکن ہے میرے تازہ خوابوں کی تعمیر میں اس دیرینہ خواب کا کچھ رنگین برادہ آکر شامل ہو جاتا ہو۔ سوجھ بوجھ کی عمر کے بعد سے نہ آپ نے مجھے دیکھا نہ میں نے آپکو، بس ایک تصور رہا کہ آپ بھی ہمارے عزیزوں میں سے ہیں
اور بڑھ رہے ہیں بہت زیادہ پڑھ رہے ہیں
اور بہت بڑے آدمی بننے والے ہیں پھر یہ بھی سنا کہ آپ چیف انجنیئر ہوگئے ہیں بڑی تنخواہ ہے۔ ٹھاٹھ باٹھ ہے یہ سن کر سب خوش ہوتے بات ہوتی آئی گئی ہو جاتی۔

بڑا حادثہ ہوا کہ آپ نے ہمارے ہاں قدم رنجہ فرمایا اور میرے لئے عنایت خاص کا بھی اظہار کیا۔ بدقسمتی سے آپ کی آمد کا تار پہنچنے سے چند ہی گھنٹے قبل میں بھائی جان کے ہمراہ ایبٹ آباد جا چکی تھی افسوس کہ ملاقات کی سعادت سے محروم رہی۔ واپس آنے کے بعد برابر آپ کا تذکرہ رہا۔ آپ کے لطیفے اور چٹکلے سنے آپکی کامیابیوں کے ——— واقعات ——— سنے آپکی عادات و اطوار کا نقشہ آنکھوں میں آراستہ ہوگیا
اور آپ کی تصویر کی زیارت نصیب ہوگئی۔

وو شادی،، ہمارے یہاں بیچاری عورت کب کرتی ہے شادی تو مرد کی

ہوتی ہے۔ عورت بچاری تو بس بکر منڈی میں لے جا کر گھمائی جاتی ہے۔ اور قصاب اسے نگاہوں سے جانچتے اور ہاتھوں سے ٹٹولتے ہیں بلکہ اگر ضرورت ہو تو ان جیتی جاگتی بھیڑ بکریوں کو ترازو پر ڈال کر تول لیتے ہیں۔ اچھی بھیڑ بکریاں تو خود ہی ہمک کر ترازو پر جا چڑھتی ہیں اور آنکھوں آنکھوں میں کہتی ہیں — دیکھا ہم کتنی فربہ ہیں۔ چھری تلے نکلنے کے لئے بہت ہی موزوں آجکل پڑھی لکھی بھیڑ بکریوں کی مانگ ہے۔ اسلئے منڈی میں یہ مال تیزی سے آ رہا ہے۔ گلے میں ایم اے اور بی اے کی سنہری سندیں آویزاں کئے چلی آ رہی ہیں۔

آجکل یہ بھی چاہا جا رہا ہے کہ بھیڑ بکری اچھی ممیانے والی ہو۔ ناچ تھرک بھی سکتی ہو، ایک باڑے کی نہ ہو بلکہ ہر طرف گھلتی ملتی رہے۔ سو وقت کی طلب کے مطابق ماڈرن بھیڑ بکریاں خوب سدھ کر آئی ہیں۔

وہ عورت کو انسان نہیں مانتے اس کی عزّت نہیں کرتے۔ بس اس سے تفریح کرتے ہیں۔

اب آپ بھی اس منڈی میں گھومنے لگے ہیں۔ میں آپ کا خیر مقدم کرتی ہوں۔ ہماری اس بکر منڈی میں آپ کی — ذوق خریداری کے مطابق رنگا رنگ مال موجود ہے۔ آپ آئیں تو سبھی چاروں طرف سے کالجوں کی سدھی ہوئی بھیڑ بکریوں کے غول آپکو گھیر لیں گے اور ہر ایک یہ آرزو کرے گی۔ کہ اسے آپکی نقرئی چھری سے ذبح ہونے کی سعادت نصیب ہو۔

معاشرے نے آپکی اس کنیز تابندہ سیما کو بھی یہاں لا کھڑا کیا ہے اور وہ اس سے یہ چاہتا ہے کہ وہ ایک ترقی یافتہ قسم کی بھیڑ بکری ثابت ہو لیکن خوش قسمتی سے اِسے ایسے ماں باپ ملے ہیں۔ جنھوں نے ایسے انسانی شعور سے مالا مال کیا ہے اور اس کے اندر مِلّی خودی کا دیا روشن کر دیا ہے — میرے سامنے خوابوں کی خیالی دنیا کا کوئی خیالی ہیرو نہیں رہا۔ بلکہ اب تک میں اپنی زندگی کی ہیرو خود ہی رہی اب آپ ہیرو بننا چاہتے ہیں سوچ میں پڑ گئی ہوں کہ کیا کروں ....

آپکی تصویر میرے سامنے ہیں۔ کاغذ کے پردے پر ایک خوبرو نوجوان اپنے ڈرائنگ روم میں کھڑا ہے۔ جبکہ چہرے سے ایک شرارت آمیز مسکراہٹ جھلک رہی ہے — تصویر میں کارنس پر سجا ہوا

——— کسی لڑکی کا مرمریں مجسمہ جو کپڑے کی دو چھوٹی سی دھجیوں سے زیادہ کا شرمندۂ احسان نہیں ہے ایک رقص کے انداز میں کیسا خوب لگ رہا ہے — اس نے کچھ عجیب انکشافات کئے ہیں وہ کہہ رہی ہے کہ ایف ایم سلامت صاحب عورت کو ہوس کا ایک کھلونا مانتے ہیں۔ ایک جھنجھنا ایک گڑیا چابی سے جھولا جھولتی گڑیا۔ وہ عورت کو انسان نہیں مانتے۔ اس کی عزّت نہیں کرتے۔ بس اس سے تفریح کرتے ہیں دل لگی کرتے ہیں۔ غم غلط کرتے ہیں۔ ہچکیوں کی گونج میں اس نے سرگوشی کی۔ کہ وہ عورت کو لباس حیا سے عاری رکھنا چاہتے ہیں — میں یہ سنتے ہوئے بالکل گم سم ہو گئی اور پھر ایک قسم کی بے ہوش سی ہو گئی — کچھ دیر ششدر رہنے کے بعد اپنے اوپر ہنسی آئی کہ خیالوں ہی خیالوں میں کس عالم سے ہو آئی آپکی تصویر سامنے ہے اور اس تصویر کے اندر ہی ایکٹرس۔ ناچ کی ایک دلآویز حرکت کے ساتھ۔

میز پر آپکی کتابوں کی قطار بھی بڑی خوبی سے سامنے نظر ہوتی۔ نظر جا کر ایک کتاب کا نام پڑھا جا سکتا ہے — زیادہ تر کتابیں انجینئرنگ کے متعلق ہیں — دیکھتی ہوں کوئی ادبی چیز بھی ہے — اچھا یہ ہیملٹ ہے اور کیا ہے — ہاں سن باتھ تو ادھر رکھا ہے نا۔ اور بائیں ہاتھ فلمستان کے پرچے تہ در تہ رکھے دکھاتی دیتے ہیں۔ فقط اس چیز کا مطالعہ کر کے آپ کی پوری شخصیت کا جغرافیہ میں نے پڑھ لیا ہے — میں نے پہلی نگاہ میں تو یہ دیکھا کہ اس سرمایۂ کتب میں کہیں وہ کتاب بھی ہے لیکن مجھے اپنی جسارتِ بیجا پر سخت ندامت ہوئی۔

اب وہ وجود رہ ہی کہاں گیا ہے اور اب تو آپ کا ایک نام ہی مسلمانوں والا رہ گیا ہے۔ باقی الحمدللہ ہم مسلمان ہیں! سوچتی ہوں جس گھر میں اور جس ماحول میں قرآن ہی کو جگہ نہ ملی ہو۔ اس میں عورت کی

آپ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اچانک ایسی پھسلواں ڈھلواں سے لڑھکاتے جائیں گے جس پر ہزاروں جوڑے لڑھک لڑھک کر ایک گندے گڑھے میں جا گرتے ہیں

کی جگہ کہاں ہوگی عورت کے لئے عزت بنانے والا تو قرآن ہی ہے وہ گیا تو عورت گئی

اب تو جگہ ایک ایکٹریس ہی کی رہ گئی ہے۔ ہنسے کھیلے۔ ناچے کودے اور خوش رکھے۔

آپ کا دل توڑنا تو مجھے کسی حال میں پسند نہیں لیکن سوچتی ہوں کہ اگر میں "لبیک" کہدوں تو مجھ پر قابو پاتے ہی آپ تقاضا شروع کر دیں گے کہ برقعہ جیسی علامت ماضی کو ترک کر دو۔ پھر آپ دوستوں کی مجالس میں بٹھائیں گے اور سینما اور کلب لے جانا شروع کر دیں گے پھر آہستہ آہستہ موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے آمادہ کریں گے پھر چاہیں گے تھوڑا سا ناچ بھی جاننا چاہیئے پھر آپ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اچانک اس پھسلواں ڈھلواں سے لڑھکاتے جائیں گے جس پر ہزاروں جوڑے لڑھک لڑھک کر ایک گندے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ اور پھر وہ کبھی نہیں نکل سکتے

آپ کے ساتھ چلوں تو میرا مستقبل یہی ہو سکتا ہے اور اس کے تصور سے میں کانپ جاتی ہوں۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کیوں نہ آپ کو بچانے کے لئے آگے بڑھوں۔ قوم کو ایک قیمتی اور ذہین جوان کو جو اسکی تعمیر و ترقی کے دروازے کھولنے والی موثر طاقت بن سکتا ہے پرائے افکار کے جادو سے چھڑاؤں گھٹیا اور گندے جذبات و مقاصد سے نکال کر خودی کے مرتبہ بلند پر لے آؤں۔ مگر ــــ مگر ــــ اپنی جیسی صدہا لڑکیوں کا انجام دیکھتی ہوں تو ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ مقابلہ سلامت کی ذات سے نہیں ایک فرد سے نہیں، ایک عالمی طوفان سے ہے۔ اور اس عالمی طوفان کے مقابلہ میں تابندہ سیما جیسی لڑکی کیا کر سکتی ہے۔

تابندہ سیما دل کی کمزور نہیں ایمان اور خودداری رکھتی ہے، مگر اس کا یہی کارنامہ بہت ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو بچا لے جائے اور اپنے ہونے والے گھر کو قلعہ کی طرح محفوظ رکھکر اس کے اندر عمر کے چند سال مسلسل پتیہ ماری کرے اور اس کی حدود میں نیا ماحول بنائے اور تعمیری کام کے لئے کردار کی تشکیل کرے۔ بس یہ ایک امنگ ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے ــــ یہ اگر نہ رہے تو میں بآسانی تیار ہو جاؤنگی کہ سلامت کی خاطر بھیڑ بکری بن جاؤں اور ذبح ہو جاؤں۔۔۔

ہاں آپ کے پیغام کے ساتھ میرے والدین کے سامنے ایک پیام اور بھی آیا تھا ایک سادہ غریب نوجوان ہے تعلیم یافتہ بھی ہے اور مسلم بھی اس کے سرمایۂ ایمان و اخلاق کو دیکھتی ہوں تو اس کا ہاتھ تھام لینے کو جی چاہتا ہے ایک مجاہدانہ سا ولولہ ابھر آتا ہے

دوسری طرف آپ کی تنخواہ

میری قوم۔ میری تہذیب سب میرا دامن پکڑ لیتے ہیں

ادھر مڑنا چاہتی ہوں تو میرا ایمان، میری قوم، میری تہذیب، میری تاریخ سب میرا دامن پکڑ لیتے ہیں۔

بڑی دیر میں اس کشمکش میں مبتلا رہی۔ آج صبح کی نماز کے بعد میں نے اپنے آقا سے گڑگڑا کر دعا کی۔ اور پھر وہیں بیٹھے بیٹھے آخری فیصلہ کیا تھوڑی دیر پہلے امی کو اشارۃً آگاہ بھی کر دیا

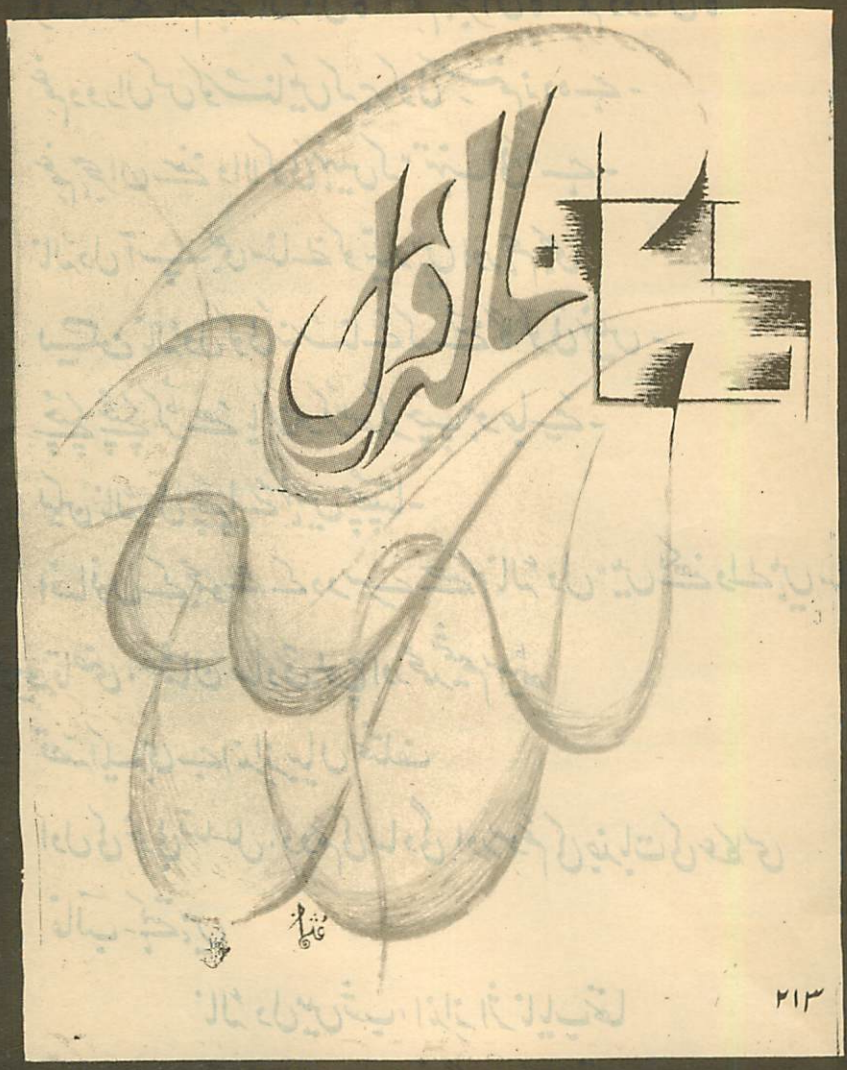
خالدون

نالۂ دل

افسانہ نام ہے نالۂ دل کا ، غمِ ہجراں کا ، غمِ دوراں کا

غمِ دوراں کس کو سنائیں کہ ہر کوئی ستم زدہ ہے ۔

غمِ ہجراں سننے والا کوئی نہیں کہ "تنہائی" ہے ۔

نالۂ دل آپ بھی سنانے کو تیار ہیں اور ہم بھی

لیکن نالۂ دل کوئی نہ سنائے کہ سنے گا کوئی نہیں ۔

چپکے چپکے کڑھئے یا کڑھ کڑھ کر چپ ہو جایئے ۔

لیکن نالۂ دل چھپائے نہیں چھپتا ۔

افسانوں کے مجموعے کے دوسرے حصے "نالۂ دل" میں لکھنے والے ہیں سال دوئم سے

صبیحہ قاضی ، عثمان صادق بلوچ اور محمد شمیم سیٹھ

قصہ ایک ہی ہے اندازِ بیاں مختلف

اول کی خوبی تسلسل ، دوئم کی سادگی اور سوئم کی جذبات کی عکاسی

غالب کہتے ہیں

نالۂ دل میں شب ، اندازِ اثر نایاب تھا

تھا پسند بزم وصل غیر گو بے تاب تھا

صدیر اعلیٰ

SCANNED BY
OFFICES OF
AMIN H. KARIM
MD

اے خلوص و محبت

صبیحہ قاضی

"کتنا خوبصورت درخت ہے یہ اور کتنے معصوم ہیں محبت جیسے مقدس جذبے کو نبھانے کے عہد و پیماں، اس نے کھڑکی سے سر ٹکائے یوکلپٹس کے درخت کی طرف دیکھ کر سوچا جس کی محبت بھری چھاؤں میں دو سائے کتنے خلوص سے محبت نبھانے کے عہد و پیماں کر رہے تھے لیکن نہیں، یہ وعدے زمانے کی زد میں آکر وفا نہیں ہوتے۔ مگر یہ بھی تو ہوتا ہے کہ یہ دل جنت میں جا کر ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں اور پھر افسانہ نگار اپنے افسانوں کے لئے مواد کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے ہیں، اس نے گویا اپنے آپ کو تسلی دی،

کتنا معصوم ہے انسان، طفل تسلیوں سے دل بہلا لیتا ہے لیکن وقتی طور پر سہی تھوڑی دیر کے لئے یکسوئی مل جاتی ہے اور اس نے جیسے مطمئن ہو کر درخت کی طرف دیکھا لڑکی کی خوبصورت آنکھوں میں پیار کے دیپ جھلملا رہے تھے

اوہ خدایا! کہیں یہ دیپ بجھ نہ جائیں۔ ورنہ کائنات میں اندھیرا ہو جائے گا،

کہیں یہ پیار بھرا دل ٹوٹ نہ جائے ورنہ خدا کہاں ملے گا۔۔ یہی کچھ سوچتی ہوئی وہ باہر برآمدے میں نکل آئی یہ سہانا موسم بھی کبھی کبھی کتنا ظالم بن جاتا ہے، جب انسان کو ماضی کے تلخ مگر در حقیقت شیریں لمحات کی یاد دلاتا ہے وہ لمحات جو کبھی روح کی زندگی ہوتے تھے آج زندگی کا ناسور بن گئے ہیں مگر یہ فلسفہ کس خوشی میں بگھاڑ رہا ہے مس شبانہ منیر" اس نے چونک کر اپنے آپ سے سوال کیا اور خود ہی مسکرا دی لیکن یہ کیسا درد تھا جس کی ٹیسیں لبوں کی مسکراہٹ میں بھی نہ دب سکیں۔

بھیگی بھیگی اس چاندنی میں وہ یادوں کی اتھاہ گہرائیوں میں لڑھکتی چلی گئی، وہ بھی اک خوشگوار دن تھا جب میں سکالرشپ پر باہر گئی تھی کتنی خوش تھی میں جب غیر ملکی طلباً و طالبات کی تعارفی پارٹی میں راجندر مجھے ملا تھا، کتنا خلوص تھا اس کی باتوں میں کتنا اعتماد تھا اس کے انداز میں۔ پہلی ہی ملاقات میں میں اس کے کس قدر نزدیک ہو گئی تھی گویا میری

روح ازل سے ہی اس مسحور کن شخصیت کی متلاشی تھی، اور پھر میں نے امی کو خط میں اُس کی ساری باتیں لکھ دیں مگر امی۔ پیاری امی! آپ کتنی دور اندیش تھیں جو مجھے کوئی وجہ نہ بتائے ہوئے بھی محتاط رہنے کی نصیحتیں کرتیں تھیں مگر آپ مجھے وجہ بتاتیں بھی تو کیسے جب کہ آپ جانتیں تھیں کہ آپ کی بیٹی کتنی ضدی ہے،، دو آنسو اُس کے گالوں پر گدگدی کر گئے، اُس نے جھرجھری لی اور آنسو کو ڈوپٹے میں جذب کر لیا، وہاں کتنی عظیم ہستی ہے آج دنیا میرے لئے کتنی ویراں ہے اس نے دکھ سے سوچا۔

اور پھر کس اندھے اعتماد سے میں اُس کے قریب ہوتی گئی میں بھی کتنی پاگل تھی جس نے انسانیت کے جذبے ہٹ کر کبھی سوچا بھی نہ تھا جسے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ معاشرتی مصلحتیں کس طرح انسانوں کے درمیان دیوار بن کر حائل ہو جاتیں ہیں، کتنے عجیب خیالات تھے میرے۔ میری معصومیت نے ان حقیقتوں کو کبھی اُبھر کر سامنے نہیں آنے دیا تھا اس حد تک نہیں کہ انہیں دیوار سمجھ لوں۔ لیکن تم نے مجھے کبھی نہ بتایا حقیقتیں تلخ ہوں یا شیریں۔ انہیں ماننا ہی پڑتا ہے حتیٰ کہ ان حقیقتوں کو بھی جو بے بنیاد ہوتے ہوئے بھی گہری بنیاد رکھتی ہیں

محبت کی معراج روحوں کا ملاپ ہے میرے اس مقولے پر ساتھیوں کے قہقہے میرے سینے میں شگاف ڈال دیتے ہیں کیا یہ صحیح نہیں۔ میں تو آج بھی دل سے اس پر یقین رکھتی ہوں۔ جب میں اپنے شاگردوں کی آنکھوں میں وہ پیار، خلوص اور جذبہ روشن دیکھتی ہوں۔ جس کی چمک میری آنکھوں میں بھی ابھی تک موجود ہے اگرچہ وقت کی دھول نے اسے مدھم کر دیا ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں پیار، خلوص اور وفا کے یہ دیپ کبھی نہ بجھنے دوں۔ مگر میں تو خود مجبور ہوں میرے پاس تو اپنے درد کی دوا نہیں ہے میں دوسروں کے دکھ کا درماں کیونکر کر سکتی ہوں پھر بھی میں ہمت نہ ہاروں گی اپنی آنکھوں کی چمک جس میں پیار کی پیاسی بہت نمایاں ہے کبھی ختم نہ ہونے دونگی کبھی نہیں اور پھر! پھر! پھر یہ ہو گا کہ میرا راجو مجھے مل جائے گا اُس نے آنسوؤں سے بھرے ہوئے کٹوروں کو دھیرے سے پلکوں کے پیچھے چھپا لیا "میرا راجو مجھے ضرور ملے گا۔۔ اس دنیا میں نہ سہی اس کے بعد بھی خلوص اور پیار کا جذبہ تو ہمیشہ زندہ رہتا ہے، لیکن راجو۔ تم بھی تو میرے خیالات کی قدر کرتے تھے۔ پھر بھلا میں کیسے انہیں

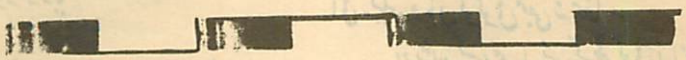

میں نے کویا ایک سہارا ڈھونڈا

اس سہارے کو اس نے ہلکی سی ٹھوکر

سے چلنا چور کر دیا

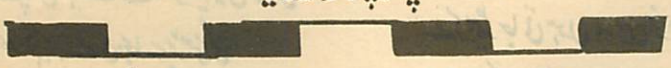

جھوٹا سمجھ لیتی۔ اونہہ؟؟ یہ لوگ تو جذبات کو کھوٹے سکے کی طرح بے قیمت سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کتنا حقیر ہے مگر میں تو انسان کی عظمت پر یقین رکھتی ہوں

کو واپسی کا دن آ گیا۔ دنیا ہمیں مسیحا کے نام سے جانتی تھی کیا خبر تھی کہ یہ مسیحا خود ہی کسی مسیحا کے محتاج ہو گئے۔ دوسروں کو زندگی دینے والے خود زندگی کی لذتوں سے محروم ہوں گے لیکن میں تو سب سے بڑا مسیحا خدا کو مانتی ہوں ایک نہ ایک دن دکھ ضرور کٹیں گے،، اُس نے خیالات کے اس دھارے کے سامنے بند باندھنا چاہا لیکن یادوں کی تپش اُس سے برداشت

نہ ہو رہی تھی

"راجندر بھی کتنا بزدل تھا۔ لیکن اس کی باتوں میں فریب نہ تھا۔ اُس نے تو مجھے کہہ دیا، "شبی، ہمارے درمیان ایک بہت بڑی دیوار ہے۔ مذہب اور رقومیت کی دیوار شاید شاید۔ میں دیوار کو ڈھا نہ سکوں گا۔ تم... تم اپنے راجو کو گناہ گار نہ سمجھنا"

"اور میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہ گئی

"تم نے بہت دیر کی راجو"، میں اس کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ سکی

"لیکن تمہاری شبی کا کیا بنے گا"، میں نے گویا ایک سہارا ڈھونڈا

"ارے تم نے اتنی جلدی اپنا عقیدہ بدل دیا... تو تو کہتی تھی کہ محبت کی معراج روحوں کا ملاپ ہے؟" اس نے ہلکی سی ٹھوکر سے اس سہارے کو چکنا چور کر دیا

"اور پھر تم نے مجھے دنیا میں رہتے ہوئے چھوڑ دیا لیکن میری ماں یہ دنیا چھوڑ کر دوسری دنیا میں چلی گئی میری آنکھوں کے کناروں میں اٹکے ہوئے آنسو صرف ماں کی رحمہ سے باہر نہ نکلا کرتے تھے زندگی کی پرخار راہوں میں میں پھر اکیلی تھی اور آنسو بھی میرے پاس بہت تھے۔ مگر یہ کیسی لو تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ کم ہونے کی بجائے بڑھتی گئی"

چاہے میرے قہقہے میرے لئے
اجنبی کیوں نہ ہوں لیکن ان
کی کھنک میں دوسروں کے لئے
زندگی کا پیغام ضرور ہوگا۔

"بی بی جی۔ آپ کا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے"، بوڑھے ملازم نے کمبل اپنے گرد لپیٹتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا

"نہیں بابا مجھے بھوک نہیں"، اس نے دھیرے سے کہا۔ "آپ کھانا کھا کر سو جائیں"

"راجو! آج کتنے عرصے کے بعد تم نے پھر میرے خیالات چرا لئے ہیں اور دیکھ۔ آج میرے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں.. میں میڈم کے نام سے پکاری جاتی ہوں۔ میرے شاگرد میرے بچے ہیں میری کل کائنات اور وہ بھی تو مجھ سے بہت بہت خوش ہیں... کیونکہ وہ اپنی میڈم کے قہقہوں کے پیچھے کچلے ہوئے ارمانوں کا خون نہیں دیکھ سکتے۔ وہ مسکراہٹوں میں دبی ہوئی سسکیاں نہیں سن پاتے، وہ انہیں خیالوں میں گم تھی۔ پھاٹک پر دستک سنائی دی..

"شاید میرا راجو آگیا.. وہ لپک کر پھاٹک کی طرف آئی۔ لیکن وہاں تو کوئی بھی نہ تھا..

"شاید کسی ہمسائے کے گھر کوئی آیا تھا یا پھر اس کا وہم تھا

"مجھے اس کے آنے کا انتظار کیوں ہے جو شاید کبھی نہ آئے گا۔ تو پھر تم اپنے غموں کی نمائش کیوں کرتی ہو۔ زخموں کو کیوں گہرا کرتی ہو۔ تمہارا کام تو زخموں کو مٹانا ہے بڑھانا نہیں میری شخصیت بھی کتنی بکھری ہوئی ہے۔ پتا نہیں کیسی سوچیں لے کر بیٹھ جاتی ہوں.. میں خواہ مخواہ کیوں پریشان ہو جاتی ہوں میری مسکراہٹ سے میرے شاگرد خوش ہوتے ہیں۔ مریضوں کے چہرے دمک اٹھتے ہیں۔ پھر میں کیوں نہ مسکراؤں۔ اپنے لئے نہ سہی دوسروں کے لئے سہی۔ چاہے میرے قہقہے میرے لئے اجنبی ہی کیوں نہ ہوں لیکن اُن کی کھنک میں دوسروں کے لئے زندگی کا پیغام ضرور ہوگا۔ میں جیئوں گی۔ دوسروں کے لئے اور پھر ابد میں جب میں تم سے ملوں گی تو تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میں غمگین رہی ہوں۔ یہی وہ روشنی ہے جس نے میری زندگی کی شمع جلا رکھی ہے ورنہ تمہاری شبی کب کی مٹی کے ڈھیر تلے ہو چکی ہوتی"

"بی بی باہر بہت سردی ہے۔ اندر آجائیے"، بوڑھے ملازم نے ایک دفعہ پھر آواز دی،

"ہاں سردی تو واقعی بہت ہے"

پسند اپنی اپنی

پریشم آن ملو

عثمان صادق بلوچ

باھر پڑے ھوتے لالو چاچا کے بڈھے کتے نے بڑے فلسفیانہ انداز میں ذرا دیر کیلئے بڑھاپے کی ستائی ھوئی آنکھیں کھولیں اور شانو کو دیکھ کر پھر بند کر لیں یا شاید وہ فوراً ھی بند ھو گئیں۔

"میرے ساتھ کھیلو گی؟" معصوم سے شانو نے ننھی سی آشی سے پوچھا۔

"نہیں" آشی نے شرارت کے ساتھ گول گول آنکھیں مٹکا کر کہا۔

شانو کے ننھے سے دل کو ٹھیس تو لگی مگر وہ صبر سے کام لیتے ہوئے بولا

"میرے ساتھ کیوں نہیں کھیلو گی؟"

"بس کہہ جو دیا نہیں" پھر ذرا رک کر بولی "تمہارے پاس تو کھلونے بھی نہیں اور میرے پاس گڑیا بھی ہے اور بہت سے کھلونے بھی" یہ کہہ کر آشی پھر گڑیا سے کھیلنے لگی

"ننھی تم کھانا نہیں کھاؤ گی۔"

"آشی امی کہتی تھیں کھلونے نہیں بولا کرتے"

"بولتے ہیں جی" آشی نے معصومانہ انداز میں جواب دیا۔ شانو چارپائی پر بیٹھ گیا گویا آشی سے بحث کرنا چاہتا ہو اتنے میں شانو کی بکری وہاں آکر کھڑی ہوئی اور ادھر ادھر منہ مارنے کے بعد جب گھاس کا کوئی تنکا نظر نہ آیا تو اس نے گڑیا کے چھوٹے چھوٹے کپڑے منہ میں دبا لئے آشی رونے لگی اور بکری ایک فراک منہ میں دبائے بھاگ کھڑی ہوئی۔ شانو اپنی بکری کے پیچھے بھاگا۔ بکری کلانچیں بھرتی لالہ جی کے صحن میں جا گھسی وہاں مرغیاں دانا چگ رہی تھیں ایک دم سے پھڑ پھڑا کر باہر بھاگ گئیں۔ لالہ جی کی بیوی پاندان چھوڑ کر اندر سے بھاگی آئیں "یہ موا فضلو کا چھوکرا اپنی بکری کو کبھی نہ باندھے ہے ہمیں ہر وقت کھراب کرے ہے اب کے تو ٹانگ توڑوا کے ہی شانتی پاوے گی" محلہ کے سب بچے خالہ نارائن سے بہت ڈرتے تھے وہ ہر وقت بے چاروں پر ٹوکا ٹوکی کی جھڑی لگائے رکھتی۔

شانو خالہ نارائن کو آتے دیکھ کر ایک دم سہم گیا اس کا سانس پھولا ہوا تھا اس نے فوراً خالہ کے آگے ہاتھ باندھ دیئے "خالہ جی ..... بس ..... بس۔ اب کے آئے گی تو بے شک مجھے مار لیجئے گا۔"

"ایک تھپڑ شانو کے ننھے سے رخسار پر پڑا اور لالہ جی کی چھڑی جو لالہ جی کے علاوہ بھٹکے ہوئے جانوروں کو بھی راہ دکھائی تھی بکری کی ٹانگ پر جا لگی نارائن بے اولاد تھی وہ ننھے دلوں کی معصوم دھڑکنوں کو کیسے سمجھ سکتی تھی شانو کو اس وقت صرف آشی کی گڑیا کے کپڑے چھیننے اور پھر ان کو آشی تک پہنچانے کی فکر تھی وہ آشی کو روتے ہوئے نہ دیکھ سکتا تھا جونہی بکری چھڑی کھا کر بھاگی شانو اس پر جھپٹ پڑا اور اس کے گردن کے گرد پڑی گھنگھروں والی پٹی سے جا دبوچا غصے میں دو چار

ہتھڑا اس کے منہ پر جا ئے اور فراک اس کے منہ سے چھین لیا شانو نے غور سے دیکھا تو فراک کے چند موتی بھی ٹوٹ چکے تھے۔

وہ جھلا اٹھا "یہ کیا کیا تو نے؟" ایک زوردار ٹانگ اسے رسید کی اور وہ کان چھڑا کر سرپٹ بھاگتی ہوئی کھیتوں میں جا گھسی۔ بوڑھا رحیمو شور مچاتا ہوا بکری کے پیچھے ہو لیا اور شانو بھاگ کر آپا پاری کے گھر میں گھس گیا آپا پاری روٹیاں پکا رہی تھی اور گلو زمین پر بیٹھا آٹے سے بیل بنا رہا تھا شانو کو دیکھ کر ایک دم خوشی سے اچھل پڑا "شانو یہ دیکھو یہ چلتا ہے تم کہتے تھے نہیں چلے گا"۔

"ہاں ہاں چلتا ہے" شانو نے ہانپتے ہوئے جواب دیا اور جلدی سے خالہ کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

"گلو نے اپنی فتح کی خوشی میں ایک زوردار مکا بیل کو مارا اور بولا" دیکھو شانو اب یہ بسکٹ بن گیا ہے۔"

مگر شانو آپا پاری سے باتوں میں مصروف تھا آپا محلے کے بچوں سے بہت پیار کرتی تھی اور شانو کو تو خاص طور پر بہت چاہتی تھی روٹی توے پر ڈالتے ہوئے شانو سے پوچھنے لگی "شانو روٹی کھاؤ گے"۔

"نہیں آپا" شانو نے کہا "آپ روٹیاں پکا کر یہ ٹھیک کر دیں" اور اس نے گڑیا کا فراک آپا کی جھولی میں ڈال دیا "آشی کی گڑیا کا فراک بکری نے خراب کر دیا ہے"

آپا نے گیلا فراک چولہے کے پاس رکھ دیا اور خود برتن سمیٹنے لگی۔ گلو کا بیل دلدلا بسکٹ جل چکا تھا اور وہ مشک بنانے میں مگن تھا وہ بناتا تو بہت کچھ تھا مگر ان کا انجام ایک مکا پھر بسکٹ پھر چلتا ہوا آٹا۔ شانو کو اس کی یہ عادت پسند نہ تھی اگرچہ اسے گلو کے بنائے ہوئے کھلونے بہت پسند تھے آپا پاری نے چند موتی تلاش کیے اور فراک میں ٹانکنے لگی کھڑکی کے سامنے والے مکان میں وشنو بانسری بجا رہا تھا۔ شانو کو اس کی آواز بہت بھلی لگتی تھی جیسے ہی اس نے بانسری بجانی بند کی شانو نے اپنا پرانا فقرہ دہرایا "وشنو جی ہم کو بھی سکھا دیں"

"کرشن مہاراج کی یہ مرلیا تو مہان ہے پر تو تم بالک ہو ابھی۔ اسکول جانے سے چھوٹ جاؤ تو یہ کلا بھی سیکھ لینا"۔

آپا پاری سے فراک لے کر شانو گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ سردار بھیم سنگھ پیپل کی چھاؤں میں بیٹھا بیڑی کے وہ آخری کش لگا رہا تھا جو انگلیاں جلانے کے بعد نصیب ہوتے ہیں۔ چاچا رحیمو بڑھاپے اور پنجالی کا بوجھ اٹھائے پسینے میں شرابور گھر کی طرف آ رہا تھا۔ شانو اس سے چھپتا ہوا جوہا گا تو لالہ جی کی چارپائی سے جا ٹکرایا شانو کو چارپائی کے پاس پڑے دیکھ کر بولا "مہاراج ہن اٹھ پو کراجے رونا جے"

شانو کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھا اور پھر بھاگ کھڑا ہوا۔

باہر پڑے ہوئے لالو چاچا کے بڈھے کتے نے بڑے فلسفیانہ انداز میں ذرا دیر کے لئے بڑھاپے کی ستائی ہوئی آنکھیں کھولیں اور شانو کو دیکھ کر انہیں پھر بند کر لیا یا شاید وہ خود ہی بند ہو گئیں

آشی اسی چارپائی پر لیٹی گڑیا کو سلانے کی کوشش کر رہی تھی اور کشر ایسی کوشش کے دوران وہ خود سو جایا کرتی تھی۔ آشی کا باپ پاس بیٹھا حقہ پی رہا تھا حسب معمول وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اس کی سوچ اس بلی سے مختلف نہ ہو گی جو سامنے بیٹھی بلی کو چھیڑے کھاتے دیکھ رہی ہو۔

"سلام چاچا" شانو نے کہا اور جلدی سے فراک آشی کی طرف بڑھا دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چاچا اس کے بارے میں پوچھے گا فراک دیکھ کر وہ چپ رہا اور بدستور فضا کو دھوئیں سے پراگندہ کرتا رہا۔ آشی جو کہ ابھی چند لمحے پہلے شانو سے انتقام کے منصوبے بنا رہی تھی۔ فراک پر نئے موتی دیکھ کر کھل اٹھی۔ شانو اسے بہت بھلا لگا اور کھیلتے کھیلتے ان کا بچپن لڑکپن میں یوں ڈھل گیا جیسے اک کلی ادھ کھلا پھول بن جاتی ہے اور اسے کسی حد تک اپنی ہستی اور ماحول کا احساس ہونے لگتا ہے۔

"ماں میں پاس ہو گیا" شانو صحن کے دروازے سے ہی چیخا۔

ماں پیپل تلے بیٹھی آشی سے بال بنوا رہی تھی خوشی سے ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ شانو جذبات سے بے قابو ہو کر ماں سے لپٹ گیا آشی بھی اپنا دوپٹہ درست کرتے ہوئے اٹھی شانو نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ آشی کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہی تھی اور اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں آنسو مسکرا رہے تھے اس نے ایک دم انہیں دوپٹہ سے پونچھ دیا اور فوراً شانو کی امی کی طرف متوجہ ہو کر مسکراتے ہوئے بولی "خالہ آپ کو بہت مبارک ہو" شانو اب بھی آشی کی طرف دیکھے جا رہا تھا اس کی حالت بالکل ایسی تھی جیسے سمندر بے قابو ہو کر اپنی باہیں موجوں کی صورت میں پھیلا کر چیختا ہوا ساحل سے لپٹنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے اندر چھپاتے ہوئے قیمتی موتی اس کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔

"آشی تم تو کہا کرتی تھی کہ میں صرف کھیتوں پر کام کر سکتا ہوں یا بانسری بجا سکتا ہوں اب بتاؤ میں میٹرک بھی پاس کر چکا ہوں" شانو نے شوخی بھرے لہجے میں کہا۔

"اچھا۔ اب شیخی نہ بگھارو" آشی نے مسکراتے ہوئے نظریں جھکا لیں اور ماں ہنستی ہوئی کھانا لینے چلی گئی۔

"شانو"

"کیا بات ہے؟"

"تم پاس ہو گئے ہو" آشی نے نہایت معصومیت سے پوچھا۔

"کیا تمہیں ابھی شک ہے" اس نے شرارت سے کہا۔

"نہیں تو"

"پھر"

"پھر تمہیں مبارک ہو" آشی نے کہا اور شرم سے نظریں جھکا لیں۔

"بڑی جلدی یاد آیا" شانو نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا اور آلتی پالتی مار کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ماں نے کھانا لا کر رکھا اور وہ کھانے لگا۔

شام کو وہ صحن میں اکیلا لیٹا مستقبل کے منصوبے بنانے لگا۔ بانسری دانتوں میں دبائے وہ خیالات کے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا کہ گندم کے چند دانے اس کے منہ پر آ کر گرے اور ساتھ ہی آشی شانو کے پاس آ کھڑی ہوئی "تم پھر آ گئی ہو" شانو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر جاؤں" آشی نے بسورتے ہوئے پوچھا

"خیر اب آ ہی گئی ہو تو آ جاؤ" اور وہ دونوں ہنسنے لگے۔

"شانو تم پاس ہو گئے ہو نا؟" آشی نے کھڑے کھڑے گفتگو کا بے مقصد آغاز کیا۔

"نہیں تو" شانو نے ذرا سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے اب تم شہر چلے جاؤ گے نا اور پھر تمہیں مجھ سے....."

بس وہ اتنا کہہ پائی اور پھر چنری کا کونا دانتوں میں دبا کر نیچے دیکھنے لگی۔

"ہاں آشی" شانو نے ناکام طریقے سے آہ بھرنے کی کوشش کی "میں گاؤں چھوڑ کر جاؤں گا۔ پھر دور بہت دور شہر میں چلا جاؤں گا اور تم کو ..... ہاں تم کو بھول جاؤں گا" شانو نے سنجیدگی قائم رکھتے ہوئے جواب دیا ایسی سنجیدگی جس کے پیچھے لاکھوں خوشیاں مچل رہی تھیں مسکراہٹیں تڑپ تڑپ کر اس کے لبوں پر رنگ بھرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور وہ بانسری کو زور سے دانتوں سے دبا رہا تھا آشی سب کچھ جانتے ہوئے غصے سے دوپٹہ جھٹک کر وہاں سے چلی گئی۔

رات گئے تک وہ وشنو جی کے سکھائے ہوئے خوشی کے گیت بانسری پر بجاتا رہا۔ بانسری کی سریلی اور مدھر سر میں ہوا میں اس طرح تحلیل ہو رہی تھیں گویا رات کو تھپکیاں دے کر سلا رہی ہوں آشی کو نیند نہیں آ رہی تھی وہ تاروں کو یوں گھور رہی تھی گویا ان کے جھرمٹ میں کہیں نیند کو تلاش کر رہی ہو آخر کار کالی رات نے ہتھیار ڈال دیئے اور صبح کاذب نے آشی پر سانولی روشنی کی چادر ڈال دی اور وہ بوجھل آنکھوں اور دکھتے ہوئے جسم کے ساتھ نماز پڑھنے چلی گئی۔

آشی کے باپ کو شانو کے پاس ہونے کی قطعاً خوشی نہ تھی بلکہ اسے تو الٹا غم اس بات کا تھا کہ زمیندار کا بیٹا فیل ہو گیا تھا اور زمیندار سے نوازشات کی امید نہ تھی۔ آشی کا باپ یہ جانتا تھا کہ زمیندار کا لڑکا آشی کو پسند کرتا ہے۔ لیکن آشی کو وہ قطعاً پسند نہ تھا آشی کو شانو کے گھر جانے سے روک بھی نہ سکتا تھا کیونکہ وہ

دسویں پاس کر چکا تھا
بزرگوں میں اس کی عزت اور
بڑھ گئی تھی۔ دسویں پاس کر
لینا ہی اس ماحول اور وقت
میں ایک بہت بڑی بات تھی۔

بہت معزز گھرانا تھا اور سب لوگوں پر ان کے بڑے احسانات تھے شانو بڑے اچھے اخلاق کا لڑکا تھا اور سب لوگ اس سے بہت پیار کرتے تھے چوپال میں جب بھی چار آدمی مل کر بیٹھتے فوراً شانو کو بلا لیتے اور وہ بانسری پر لوک گیت سنا کر انہیں محظوظ کیا کرتا وشنو جی وفات پا چکے تھے اور اب لوگ شانو کو کلاکار کے نام سے پکارا کرتے اب جب کہ وہ دسویں جماعت پاس کر چکا تھا بزرگوں میں اس کی عزت اور بڑھ گئی تھی۔

دسویں پاس کر لینا ہی اس ماحول اور وقت میں ایک بہت بڑی بات تھی اور وہ گھر کا اکلوتا بیٹا تھا اس لئے اس نے زمینداری کا سارا کام خود سنبھالا ہوا تھا دو بیلوں کی جوڑی لے کر کھیتوں میں چلا جاتا اور جب سورج لالہ جی کے باغ کے سب سے اونچے درخت کے پیچھے چھپ جاتا تو وہ بیلوں کو ہانکتا ہوا دودھ کا مٹکا اٹھائے گھر کی راہ لیتا۔

گاؤں میں اس کا جگری دوست گلو تھا جو اب گل خاں بن چکا تھا اور شانو اسے پیار سے گل کہا کرتا آٹے سے بیل اور بیل سے بسکٹ بنانے والا گل اب بڑی پیاری پیاری مورتیاں بنایا کرتا۔ ماں تو اس کی اتنی خوبصورت مورتیاں دیکھ کر خاموش رہتی

مگر باپ کے ہاتھوں کوئی سلامت نہ بچتی اکتا کر آخر اس نے مورتیاں بنانا چھوڑ دیں شانو نے پوچھا تو کہنے لگا۔ "وہ توڑ دیتا ہے"۔

شانو نے حیرت سے پوچھا "کون ظالم توڑ دیتا ہے اتنی پیاری مورتیاں؟"

گل خان مسکرانے لگا۔

شانو بھی مسکرا دیا جیسے وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا ہو پھر بولا "تو بنائے جا۔ وہ توڑتا رہے۔ تیرا فن تو نکھرے گا نا اور ایک دن وہ بھی تجھے فنکار مان لے گا۔"

سارا دن کھیتوں میں پانی لگاتے لگاتے شانو بہت تھک چکا تھا۔ بانسری لے کر درخت کے نیچے بیٹھ گیا مگر تھکن کی وجہ سے نیند آگئی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی شانو وہیں سو گیا سورج لالہ جی کے درخت کے پیچھے چھپ چکا تھا مگر شانو بے خبر سوتا رہا۔

آشی ہر روز اپنے دروازے پر شانو کو گزرتے ہوئے دیکھتی اور موقع مل جائے تو کچھ باتیں بھی کر لیتی۔ آج اس کے دل میں عجیب عجیب وسوسے پیدا ہو رہے تھے کل وہ اس سے روٹھ کر چلی آئی تھی، اس لئے شاید شانو ناراض ہو گیا ہو اسی لئے تو آج راستہ بدل گیا پھر وہ خود کو کوسنے لگی کہ صبح اس کے گھر کیوں نہ گئی اس سے تو شانو کو اور بھی غصہ چڑھا ہو گا لیکن شانو تو اس سے پاگلوں کی طرح محبت کرتا تھا وہ کسی انجانے خوف کے زیر اثر شانو کے کھیتوں کی طرف چل دی۔

شانو گہری نیند سویا ہوا تھا اور بیل اس کے قریب التجا بھری نظریں لئے کھڑے تھے گویا شانو سے چلنے کی درخواست کر رہے ہوں۔

آشی نے دھیرے سے شانو کو آواز دی مگر وہ سویا رہا اس نے اپنا ہاتھ دھیرے دھیرے بڑھایا اور جلدی سے شانو کے گال پر چٹکی کاٹ لی شانو اس وقت بہت سندر لگ رہا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ شانو اسی طرح سویا رہے اور وہ یونہی دیکھتی رہے مگر اسے گھر واپس جانا تھا پیار سے شانو کے گھنگریالے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں پھیرنے لگی شانو نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔

"شانو کل تم مجھ سے ناراض ہو گئے تھے؟" آشی نے جلدی سے پوچھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہاں کیوں آتی ہو" شانو نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں خاص طور پر آج ہی نیند کیوں آئی ہے؟" آشی نے شرارت سے کہا "اچھا اب جلدی سے چلو گھر والے انتظار کر رہے ہیں"۔

شانو نے کنوئیں سے منہ دھویا۔ پیار سے بیلوں کو تھپکی دی اور دودھ کا مٹکا اٹھائے حویلی کی طرف چل دیا۔ آشی مٹکا اٹھائے چلی آ رہی تھی شانو کو دیکھ کر مسکرانے لگی "چلو" اس نے ذرا شرمیلے انداز میں کہا۔

شانو نے مٹکا پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا "ابھی وہ وقت نہیں آیا" آشی نے اس کے ہاتھ پیچھے ہٹا دیئے اور چل دی۔ شانو بھی بیلوں کو ہانکتا ہوا پیچھے چل دیا۔

کچھ دور تک وہ دونوں خاموشی سے چلتے رہے شاید یہ پیار کی انتہا تھی کہ منہ سے کوئی بات نہ نکلتی تھی۔

"آشی"

"ہوں"

"گھر جاتے ہوئے مجھے روز دو پنچھی دکھائی دیتے ہیں" شانو نے سنجیدگی سے آشی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "دونوں ساتھ ساتھ اڑتے ہوئے بہت بھلے لگتے ہیں"

"پھر" آشی نے دو تین بار پلکیں جھپکیں۔

"آشی میں سوچتا ہوں ایک دوسرے کو چھوڑ دے تو وہ دوبارہ جیون کے ان رستوں میں کبھی نظر نہ آئے"۔

"ہوں" آشی بہت اداس ہو گئی۔

"آشی، میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں شاید یہ کبھی نہ بتا سکوں......"

شانو مسلسل آشی کی طرف دیکھ رہا تھا اور آشی بیلوں کی طرف

وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگا جہاں اکا دکا ستارے ٹمٹما رہے تھے

آشی شرم سے سرخ ہو گئی۔

اسے یوں لگا کہ ابھی یہ سپنا ٹوٹے گا اور اس کی زندگی پھر مسکرانے

شانو نے دودھ کا مٹکا آشی سے لے لیا۔ سامنے اس کا گھر تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی الوداع کہہ کر اپنے گھر چلی گئی۔

شانو کے ہر سانس میں آشی کے سانسوں کی خوشبو تھی اور آشی کے دل کی ہر دھڑکن شانو پکارتی تھی۔

آشی کو اس بات کی خبر نہ تھی کہ اس کا باپ زمیندار کے بیٹے سے اس کا رشتہ

لے کر چکا ہے اس کو یہ خبر منگنی کے روز ملی اس کی دنیا اندھیر ہوگئی اس کو یہ سب کچھ بھیانک خواب کی طرح نظر آرہا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ ابھی سپنا ٹوٹے گا اور اس کی زندگی پھر مسکرانے لگے گی۔

وہ اپنے باپ کو کیسے سمجھا سکتی تھی۔ شانو پر یہ خبر بجلی بن کر گری اس نے بانسری ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دی شدید صدمے سے اسے بخار ہوگیا اور وہ چارپائی پر بے سدھ پڑا کراہتا رہا۔

رات کو اچانک باہر شور سا محسوس ہوا کسی کی ہلکی سی آواز اس کے کانوں تک پہنچی "آشی مرگئی" اور پھر "وادی" کا لفظ سن کر وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ کمزور انسان نے ایک خوفناک چیخ ماری "آشی"

بڑی مشکل سے اپنا وجود قابو میں رکھ کر اٹھا اور "آشی تو نہیں مرسکتی" پکارتا ہوا وادی کی طرف چل دیا۔

ستارے بجھے بجھے نظر آرہے تھے رات کی سیاہی آشی کے ماتم میں اور گہری ہوگئی تھی وہ اسی پہاڑ کی ڈھلوان پر کھڑا تھا جس کے دامن میں آشی نے موت کو سینے سے لگایا تھا۔

اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا وہ دیوانہ وار پکارا "آشی میں آرہا ہوں ذرا دیر میرا انتظار کرو" اور اس نے چھلانگ لگا دی۔

● ● ● ● ● ●

شانو ہسپتال میں بے ہوش پڑا تھا اس کے سارے جسم پر شدید چوٹیں آئیں تھیں ڈاکٹروں کی تحقیق کے مطابق وہ اپنی یادداشت کھو چکا تھا پانچ دنوں کے بعد شانو کو ہوش آیا۔

گل خان کو شانو کی خبر ملی تو وہ دوڑتا ہوا ہسپتال پہنچا بچوں کی طرح بلکتا ہوا وہ شانو کے ساتھ چمٹ گیا شانو پھر بے ہوش ہوگیا نرس نے بڑی مشکل سے گل خان کو علیحدہ کیا۔ وہ روتا ہوا گھر آیا اور روتے روتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی نیند کی آغوش میں جا کے جیسے وہ ایک نئی دنیا میں آگیا۔ شانو سفید براق لباس پہنے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"فنکار تم مورتیاں نہیں بناتے اب؟" شانو نے پوچھا وہ بہت خوش نظر آرہا تھا "بناتا ہوں میرے دوست" گل نے جواب دیا۔

شانو ایک دم سنجیدہ ہوگیا

"میں نے تم سے کبھی کوئی چیز نہیں مانگی نا"

"آشی کا ایک مجسمہ بنا دو آشی سے کم خوبصورت ہوا تو سمجھو میں مر جاؤں گا۔"

سفید براق لباس پہنے شانو بادلوں میں غائب ہوگیا۔

گل خاں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

اس کے چہرے پر ننھے ننھے قطرے تھے۔

"میرے دوست نے پہلی مرتبہ مجھ سے کوئی چیز مانگی ہے چاہے میری جان چلی جائے میں اس تک ضرور پہنچاؤں گا" وہ بڑبڑانے لگا۔

ساری رات وہ آشی کو تصورات میں لاتا رہا اور جیسے ہی اس کے ذہن میں کوئی نقش ابھرتا اس کے ہاتھ حرکت میں آجاتے اس نے اپنی پوری فنکارانہ صلاحیتیں صرف

پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور گھنٹیوں کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

کر دیں آخر ایک دن مسکراتی ہوئی آشی اس کے سامنے کھڑی تھی آج ڈیڑھ مہینے میں پہلی مرتبہ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر پژمردہ سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

مورتی کو ہاتھ میں پکڑے وہ ہسپتال کی طرف بھاگا جا رہا تھا وارڈ میں داخل ہوتے ہی وہ شانو کی طرف بڑھا شانو پر آج پھر بے ہوشی کا دورہ پڑا تھا گل خاں شانو کو دیوانہ وار چومنے لگا۔

"دوست میں نے تیری خواہش پوری کر دی اٹھ نا ایک نظر دیکھ تو لے۔"

شانو بے ہوش پڑا تھا گل نے مورتی کو میز پر رکھا اور خود واپس چل دیا۔

آدھی رات کو شانو کو اچانک ہوش آگیا سامنے ایک نرس میز پر سر رکھے سوئی ہوئی تھی دائیں طرف میز پر مورتی پڑی تھی۔ ٹک ٹک اس کی طرف دیکھنے لگا نیم تاریکی میں اسے صاف طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا اس کے سر پر شدید درد ہونے لگا مجسمے کو گھورتے گھورتے اسے شدت سے گرمی لگ رہی تھی اس نے کمبل کو اتار پھینکا

وہ لنگڑاتا لنگڑاتا مورتی کی طرف چلنے لگا۔ اس کے کانوں میں عجیب قسم کی آوازیں آنے لگیں جیسے بہت دور ویرانوں میں گھنٹیاں بج رہی ہوں اسے یوں لگا جیسے مورتی اس

زہرہ اشتیاق

تو نے دل جس کو دیا اور رکھا ہے زندہ
ختم ہو جائے گی رسم وفا میرے بعد

عشق کہتے ہیں جسے کیا ہے جنوں کی منزل
ان پہ یہ عقدہ کھلا بھی تو کھلا میرے بعد

بزم ارباب محبت ہے خزاں کی زد میں
اتنا ویراں ہے اب شہر وفا میرے بعد

زندگی تھی جو کٹھن موت بھی بن جاتی عذاب
وہ تو کہیئے کوئی اتنا نہ اٹھا میرے بعد

آج کتراتے ہیں جو تلخ نوائی سے میری
وہی ڈھونڈیں گے میری صدا میرے بعد

غزل

زخم ہے شہرِ دوستاں خواب ہے خُودلبراں
اس کے سوا بھی آسماں اجرتِ عمرِ رائیگاں

آئیں گے لوٹ کر بیتے دنوں کے کارواں
روٹھ گئی ہے فصل بھی سونی پڑی ہیں بستیاں

وقت کوہ خود نگر دید و شنید بے اثر
تو ہے اُدھر تو ہیں اِدھر برف جمی ہے درمیاں

دونوں ہوا پسند ہیں دونوں کا اعتبار کیا
آنکھیں ہیں میری مشعلیں چہرا تیرا دھواں دھواں

موسمِ تر میں کتنے شجر ہیں بے لباس
جی میں یہی لگن ہے اب تجھ سے ملیں خزاں خزاں

تکیہ کرو مسافرو، سایۂ ابر و باد پر
دیکھو زمیں کو اوڑھ کر سو بھی چکیں حویلیاں

کل بھی رہیں گی فرصتیں، کل پہ رکھو ساعتیں
آؤ نصیؔر گھر چلیں رات ڈھلی کشاں کشاں

غزل

منظہر رب صدیقی

کسی ویرانے کی پھر راہ دکھاؤ لوگو
ہم ہیں دیوانے ہمیں خوب ستاؤ لوگو

خود تو ہر حال میں خوش رہا کرتے ہو
کبھی اس حال کو خوشحال بنا دو لوگو

ہم نے پوجے ہیں صنم لاکھ بنائے ہیں لیکن
دل بنانا ہمیں پتھر کا سکھاؤ لوگو

پیاس کو خون جگر جان کر پی لو پیاسو
بھوک میں بھوک کے احساس کو کھاؤ لوگو

آج بھی اہل جنوں لائے خرد کے لاشے
اک نیا شہر آشوب بناؤ لوگو

آج جاؤ گے تو پھر کب آؤ گے
آج رک جاؤ فقط آج نہ جاؤ لوگو

SCANNED BY OFFICES OF AMIN H. KARIM MD

حمایت علی شاعر

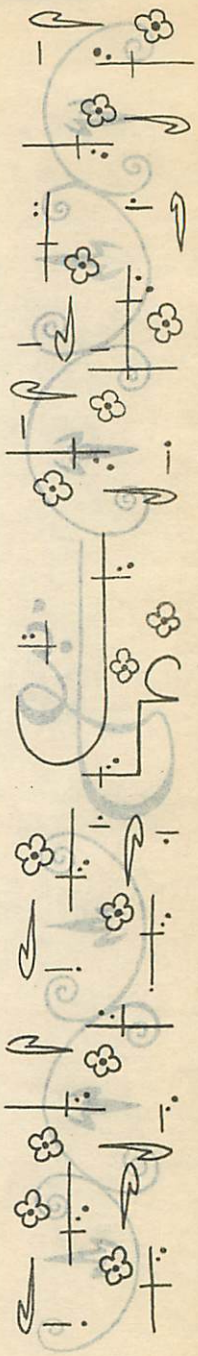

رکتا ہے اجالا کہیں ظلمت کی سپر سے
سورج تو در آئے گا ہر اک روزن و در سے

ہے تپتی ہوئی چھاؤں کہ کجلائی ہوئی دھوپ
یہ راز بھی کھل جائے گا، نکلوگے جو گھر سے

اب دل کی سیاہی میں قلم ڈوب گئے ہیں
تحریر کو نسبت نہ رہی خونِ جگر سے

اس دور میں جو شخص ہے دستار بہ سر ہے
کوئی تو ہو نکلے جو کفن باندھ کے سر پر

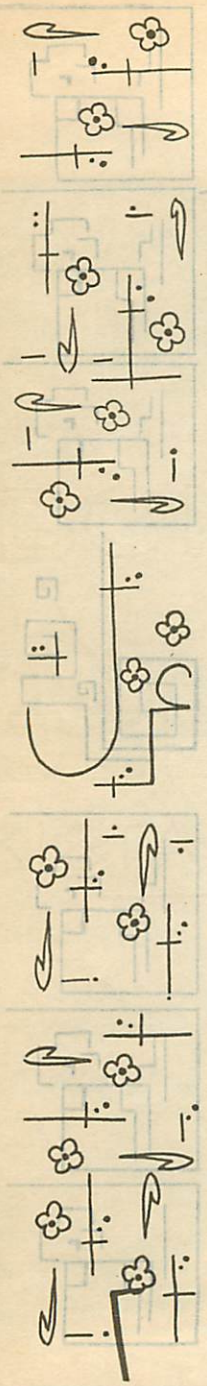

روداد محبت وہ پر درد کہانی ہے
ہر سینے میں دل خون ہے ہر آنکھ میں پانی ہے

اس اشک کے قطرے کی اتنی سی کہانی ہے
رک جائے تو طوفان ہے بہہ جائے تو پانی ہے

وہ چشم تصور میں جب سے کہ سمائے ہیں
ہر صبح درخشاں ہے ہر شام سہانی ہے

گلشن ہے بہاریں ہیں صحرا ہے اداسی ہے
وہ ان کی جوانی ہے یہ میری جوانی ہے

خلقت کا امین آخر کیوں نقص نہیں جاتا
جو نقش بنایا ہے یارب تیرا ثانی ہے

اطہر صدیقی اطہر

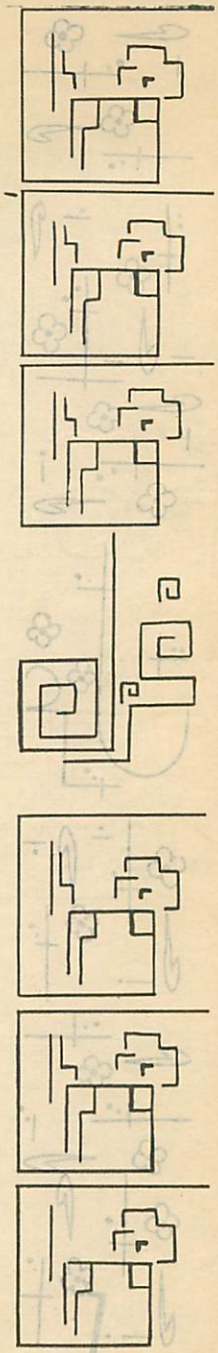

میری راہوں میں وہ کانٹوں کو بچھا دیتے ہیں
یوں بھی دنیا میں محبت کا صلہ دیتے ھیں

جب بھی پڑتا ہے برا وقت کسی انساں پر
غیر تو غیر ہیں اپنے بھی بھلا دیتے ہیں

دل تو پھر دل ہے اگر چیخ اٹھے غم سے تو کیا
چوٹ لگنے پر تو پتھر بھی صدا دیتے ہیں

کم سے کم تو نے دیا تو ہمیں جینے کا شعور
گردشِ دہر تجھے ہم تو دعا دیتے ہیں

پھول ہی پھول ہیں گلشن میں ہر اک سمت مگر
ایسے کم پھول ہیں جو بوئے وفا دیتے ہیں

غم و آلام پہ ہی موقوف نہیں ہے کوئی
حسن والے بھی تو دیوانہ بنا دیتے ہیں

پھول ہی زینت گلشن ہیں یہ مانا لیکن
پھول ہی آگ گلستاں میں لگا دیتے ہیں

محفلِ رند میں ساغر کو اٹھا کر اطہر
دوشنی ہم تو زمانے کو دکھا دیتے ہیں

محمد ارشد ندیم

ٹھیک ہے جانِ وفا مجھ کو شفا ہو نا سکی
آپ سے بھی میرے حق میں دعا ہو نہ سکی

دل کے زخموں سے میرے رسنے لگا پھر سے لہو
تلفیٔ دل کی کبھی مجھ سے دوا ہو نہ سکی

یہ کرشمہ ہے میری دیدہ وری کا یارو
جان بجز ان کے کسی پر بھی فدا ہو نہ سکی

تو نہ آیا تو جھجکتا رہا شب بھر جگنو
بن تیرے رات ستاروں میں ضیا ہو نہ سکی

بے وفائی تو حسینوں نے بہت کی ارشد
عشق والوں سے مگر ترکِ وفا ہو نہ سکی

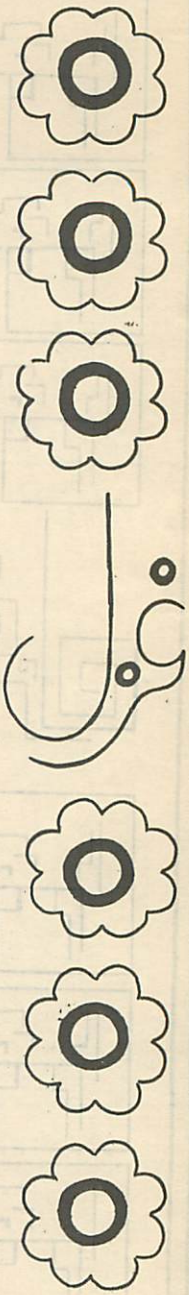

نسرین قریشی

غزل

غموں کی آنچ پا کر ہی خوشی کے دیپ جلتے ہیں
خوشی کے وقت بھی آنکھوں میں آنسو ہی مچلتے ہیں

تمنا ڈھل گئی حسرت میں، حسرت بن گئی آنسو
یہ آنسو بن کے گوہر آج بھی آنکھوں سے ڈھلتے ہیں

خزاں بن کچھ حقیقت ہی نہیں فصلِ بہاراں کی
وہی پاتے ہیں منزل کو جو ان راہوں پہ چلتے ہیں

خوشی کے چند لمحے زندگی میں آئے تھے لیکن
تصور سے بھی جن کے اب تو آنسو ہی نکلتے ہیں

کٹھن ہے کس قدر اس راہ میں منزل کا پانا بھی
یہاں ہر گام راہی ٹھوکریں کھا کر سنبھلتے ہیں

پروتے ہی رہیں شاید یونہی اشکوں کی ہم لڑیاں
یہ اشکوں کے دیئے ہر دم مری آنکھوں میں جلتے ہیں

غمِ ماضی ہے نسرین اور کچھ مبہم سی یادیں ہیں
یونہی پل پل گزرتا ہے یونہی دن رات ڈھلتے ہیں

غزل

انجم سلیم طلعت

تلخیاں گھل رہی ہیں دم بدم
قید تہذیب میں گھٹنے لگا ہے دم

جذبات رسوا، خلوص بے معنی رہا
حسرت بن گئی ہے زندگی کی سرگم

کچھ بھی ممکن نہیں بجز چشم پوشی
تیور بگڑے بگڑے اور خود سر صنم

راستی کا عجب چلا ہے آج فیشن
بولئے جھوٹ سچائی ہو دھرم

اتنا تو پیار نہ کر اب تاریکیِ شب سے
صبر کر نہ جلا آنسوؤں سے اب چشم

کیا تجھے یاد ہے اے طلعت
کیوں پریشان ہیں ابھی تک انجم

غزل

جلی ہیں آج بھی شمعیں تیرے خیالوں کی
الگ یہ بات ہے انکی ضیاء اداس اداس

تمہارے عشق میں موت وحیات تھی یکساں
جیا غموں کے سہارے۔ مرا اداس اداس

وہ خالد وہ ترا شاعر نگارِ حُسن
ابھی ادھر سے گیا اداس اداس

خالد فاروقی

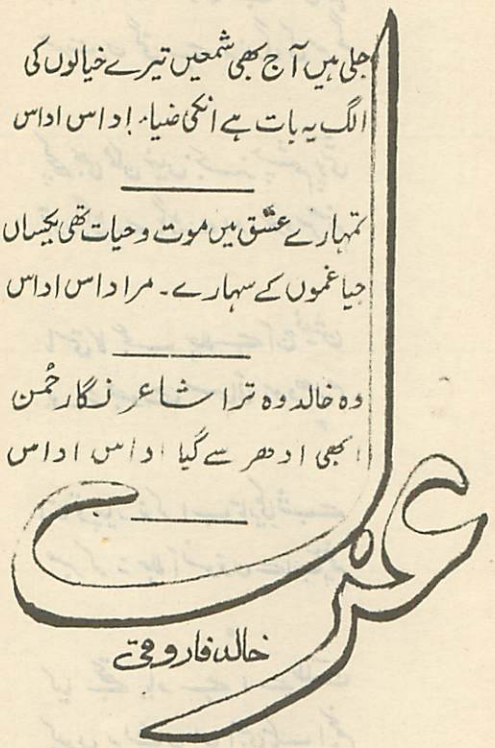

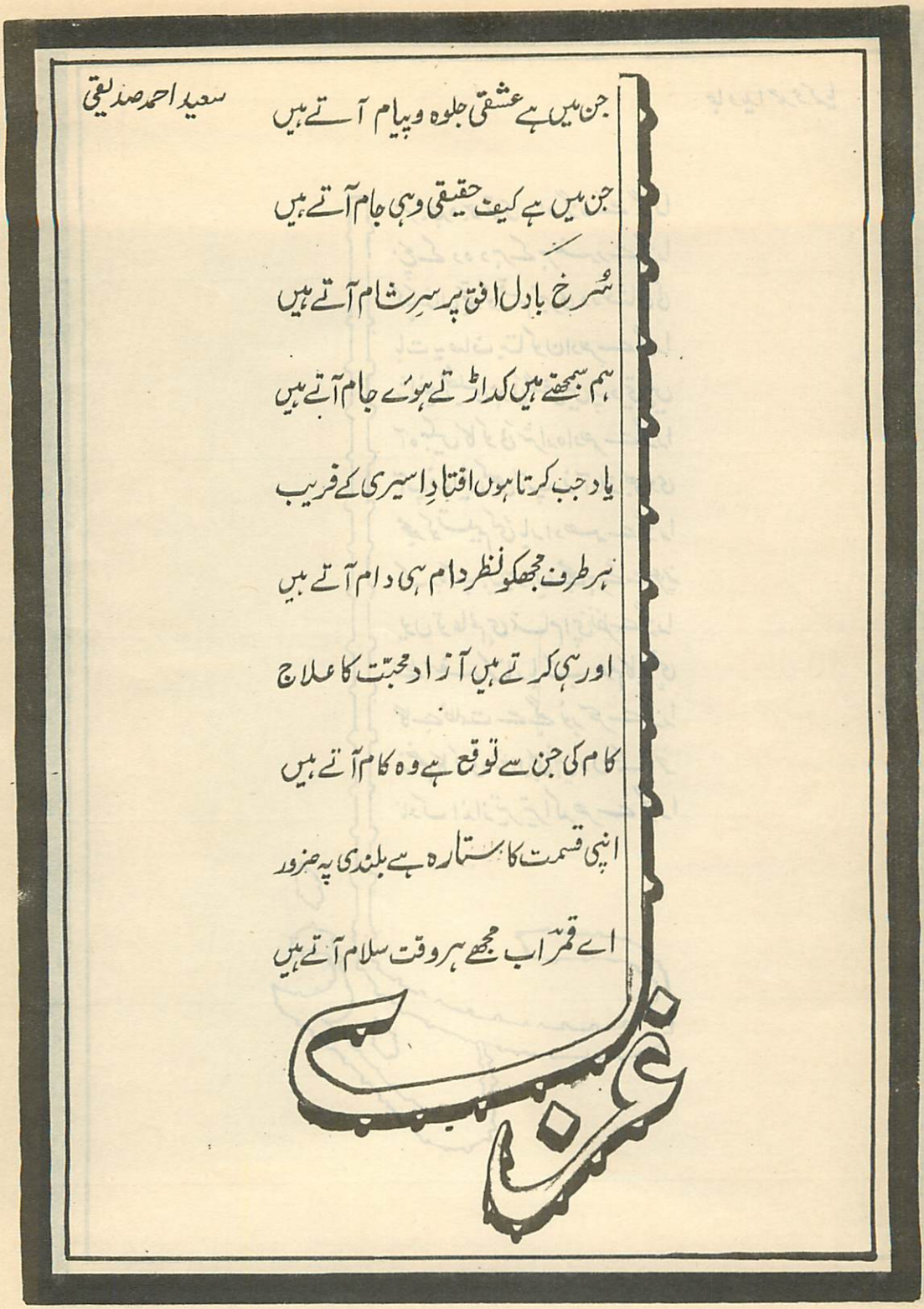

غزل

سعید احمد صدیقی

جن میں ہے عشقی جلوہ وپیام آتے ہیں
جن میں ہے کیف حقیقی وہی جام آتے ہیں

سُرخ بادل افق پر سرِ شام آتے ہیں
ہم سمجھتے ہیں کہ اڑتے ہوئے جام آتے ہیں

یاد جب کرتا ہوں افتادِ اسیری کے قریب
ہر طرف مجھکو نظر دام ہی دام آتے ہیں

اور ہی کرتے ہیں آزاد محبت کا علاج
کام کی جن سے توقع ہے وہ کام آتے ہیں

اپنی قسمت کا ستارہ ہے بلندی پہ ضرور
اے قمر اب مجھے ہر وقت سلام آتے ہیں

جاوید احمد ذکریا

سر بسجدہ جو تری راہ گزر سے گزرا
بچ کے وہ دہر کے ہر ضرر سے گزرا

کہکشاں تجھ کو قسم تیری درخشانی کی
بات یہ صاف بتا کون ادھر سے گزرا

شاخیں جھلسی ہوئی گلشن میں پتہ دیتی ہیں
آہ بیکس کا کوئی شرارہ ادھر سے گزرا

آپ فرمائیں کبھی آپ نے آواز بھی دی
مجھ کو تسلیم کئی بار ادھر سے گزرا

اک وہ آپ ہیں جو ہیں مجھے ہر شے سے عزیز
یوں تو عالم ہی تمام اپنی نظر سے گزرا

طے سفر کرتا رہا ملکِ عدم کا یونہی
گاہے ظلمت سے گہے نورِ سحر سے گزرا

زخم کا کوئی نشاں بھی نہیں دل تک آخر
ناوک انداز تیر تیرا کدھر سے گزرا

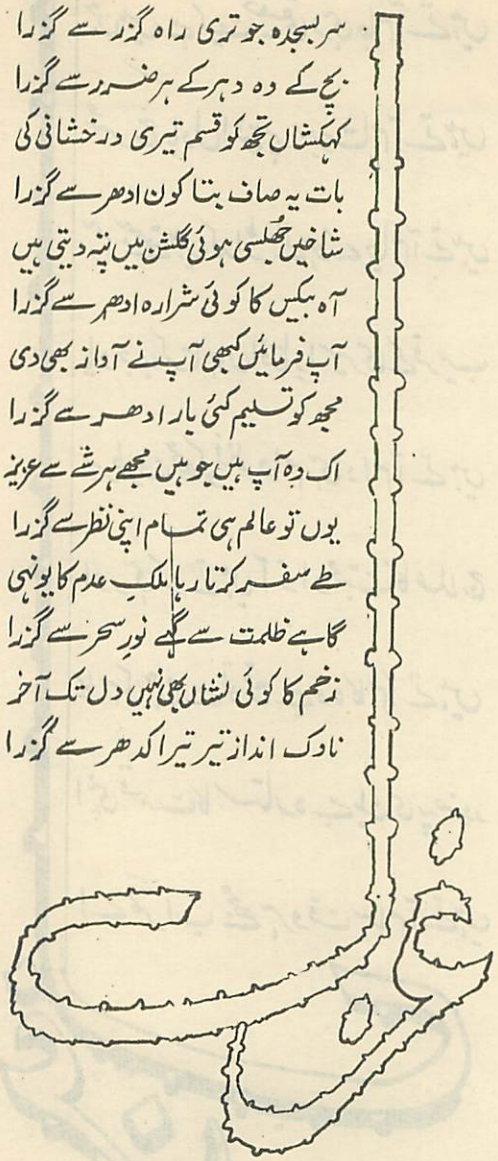

غزل

رنگینی بہار کا سامان رہا ہوں میں
وہ رشکِ صد بہار گلستاں رہا ہوں میں

آسودگی آبلہ پائی کے واسطے
محوِ تلاش خارِ مغیلاں رہا ہوں میں

قلب و جگر کی لذّت پیہم کے شوق میں
کتنا رہین ابرو و مژگان رہا ہوں میں

تاریکیوں میں شمع شبستاں رہا ہوں میں
اس غم کدے میں ہر لب فقداں رہا ہوں میں

بے چین و بے قرار امین زیست گزاری
انکے بغیر کتنا پریشان رہا ہوں میں

محمد امین وتار

غزل

معصوم اصغر (مدیر کیکول)

کچھ نقش تیری یاد کے ویراں ہوئے تو ہیں
اب مرحلے حیات کے آساں ہوئے تو ہیں

پھر کیا بھلا گزرتی ہے غیروں کے دل پہ اب
دیکھیں ہم اُن کے ساتھ پہ نازاں ہوئے تو ہیں

بامِ فلک پہ آ گیا پھر چاند عید کا
جلوے کچھ ان کی دید کے آساں ہوئے تو ہیں

محدود اب نہیں ہے میرا رنگِ تغزل
میری نوا سے مہر و ماہ لرزاں ہوئے تو ہیں

جمیلہ فردوس

دل کے مندر کو ڈھا نہیں سکتے
بیتی باتیں بھلا نہیں سکتے

جو خدا پر یقین رکھتے ہیں
دل کسی کا دُکھا نہیں سکتے

ہم نے ہر شے تیاگ کر دی ہے
آپ ملنے کو آ نہیں سکتے

ان کو دعویٰ ہے حسنِ یوسف کا
ہم تو کچھ بھی جتا نہیں سکتے

گر تبرّا جذبہ بلند ہے فردوس
کیوں یہ رسمیں مٹا نہیں سکتے

غزلیں

محمد امین وقار

عنایت چشم ساقی، رند مشرب تشنہ کام آیا
جراحت تیغ ابرو، دل ناداں زیر دام آیا
نہ تم آئے نہ چین آیا نہ دل ہی کو قیام آیا
ہر اک آہٹ نے تڑپایا کہ وہ ماہِ تمام آیا
بلایا ہر طرح من میں تو آکر بھی نہیں جھانکا
نکالا من کے مندر سے تو ظالم صبح شام آیا
محبت میں کبھی اے دوست ایسا بھی مقام آیا
اٹھائیں جب کبھی نظریں ستمگر سوئے بام آیا
پسِ چلمن کیا کرتے ہیں پرسش راز واروں سے
امینؔ ہے کون جس کا اس قدر اچھا کلام آیا

نہ کوئی نامراد آیا نہ کوئی تشنہ کام آیا
جو آیا تیری محفل سے وہی سیراب جام آیا
نہ منزل کا تعین ہے نہ کوئی راستہ روشن
خدا جانے رہِ الفت میں یہ کیسا مقام آیا
قیامت تھا تیرا محفل میں آجانا بھی اے ساقی
رکی جب گردشِ دوراں تو پھر گردش میں جام آیا
فسانہ نامکمل ہی رہا شب بھر وفاؤں کا
کہ آغازِ حکایت میں ہی لب پر ان کا نام آیا
خمارِ وفا میں نامرادی کامیابی ہے
کہ میرے نام آیا بھی تو بس خالی ہی جام آیا

شاہین بانو حنا

نہ تم آئے نہ موت آئی نہ ہی مژدہ مجا یا
یہی اک مضطرب دل تھا جو ہر دم میرے کام آیا
نتیجہ ہائے الفت ہم نے پایا بھی تو کیا پایا
جنازہ اٹھ رہا تھا جس گھڑی ان کا پیام آیا
خوشی بے کیف ہو جاتی خوشی سے ہم نہ مر جاتے
چلو اچھا ہوا کہ وقتِ رخصت ہے سلام آیا
ارادہ چھوڑ تو بہ کا وہیں توبہ سے کی توبہ
جو کافر مست آنکھوں میں لئے مینا و جام آیا
تمہیں ماجد ضرورت کیا جہاں میں حرم و کعبے کی
کیا سجدہ وہیں پر جب بھی ظالم سوئے بام آیا

سید عبد الماجد

مرزا محمد مجاہد ۔ نشتر میڈیکل کالج ملتان

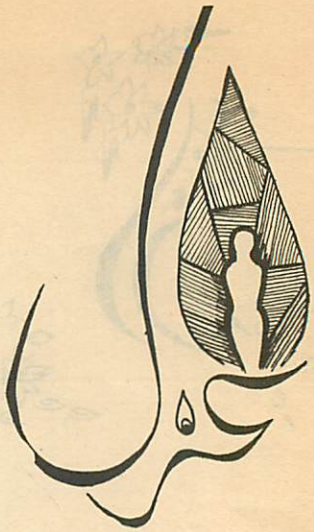

اشجار یہ تپتے ہوئے نیّر کی تپش سے
فریاد کریں آج مہرباں قفس سے
پھر سوز کی اِک آگ سی تن من میں لگا دو
جلنے سے ترے نکلیں ہم اس آگ کے بس سے
ماحول کی تطہیر کا ضامن نہیں کوئی
پاک کرے کاش کوئی اہل ہوس سے
لیلائیں کئی بن گئیں محمل کی امانت
چونکا نہ کوئی قیس تو اب سازِ جرس سے
محبوب، و محبت کی ہیں یاں تاریں ہزاروں
مانوس ہوا، میں بھی اسی قید قفس سے

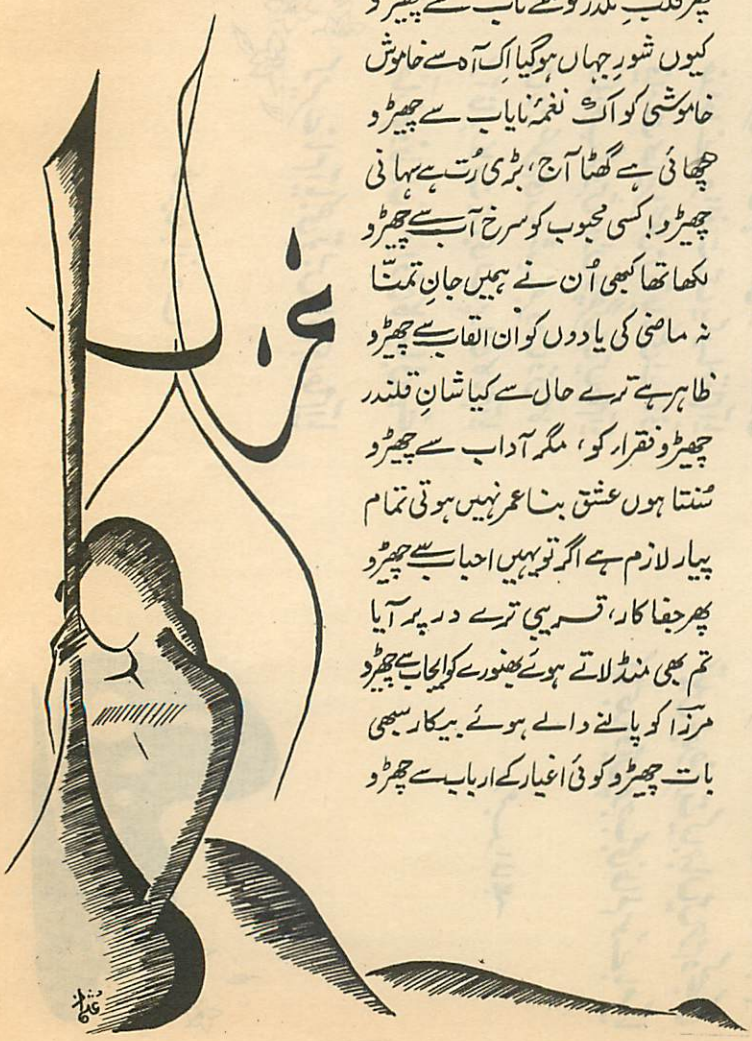

پھر بربطِ غم کو کسی مضراب سے چھیڑو
پھر قلبِ مکدّر کو مئے ناب سے چھیڑو
کیوں شورِ جہاں ہو گیا اِک آہ سے خاموش
خاموشی کو اک نغمۂ نایاب سے چھیڑو
چھائی ہے گھٹا آج، بڑی رُت ہے سہانی
چھیڑو! کسی محبوب کو سرخ آب سے چھیڑو
لکھا تھا کبھی اُن نے ہمیں جانِ تمنّا
نہ ماضی کی یادوں کو ان القاب سے چھیڑو
ظاہر ہے ترے حال سے کیا شانِ قلندر
چھیڑو فقرا کو، مگر آداب سے چھیڑو
سُنتا ہوں عشق بنا عمر نہیں ہوتی تمام
پیار لازم ہے اگر تو یہیں احباب سے چھیڑو
پھر جفا کار، قریبی ترے در پر آیا
تم بھی منڈلاتے ہوئے بھنورے کو اجاب سے چھیڑو
مرزا کو پالنے والے ہوئے بیکار سبھی
بات چھیڑو کوئی اغیار کے ارباب سے چھیڑو

آرزوئیں مٹ گئیں اور خواہشوں کا خون ہوا
اب چمن میں شاعرِ رنگین کلام آیا تو کیا

لو ہوئی موجِ نسیم اور باغبان گلچیں بنا
اب کلی کو پھول بننے کا پیام آیا تو کیا

قلب مفتوں ہر گھڑی معروف دیدۂ خونبرد
وہ ستمگر برقِ ساں بالائے بام آیا تو کیا

جل بجھا ہوا ہوں ہجر میں ہے حال دل ناگفتنی
آہ قاصد لے کے مژدہ تیر گام آیا تو کیا

چشمِ میگوں کا تصور مست رکھتا ہے امینؔ
ان کی بزمِ ناز سے گر تشنۂ جام آیا تو کیا

محمد امین وقار

خلش

انجم آرا منظر

تم نے پوچھا ہے مرے دوست بڑے پیار سے آج
میری پلکوں پہ لرزتے ہوئے اشکوں کا سبب؟
میرے چہرے پہ اداسی کے یہ سائے کیوں ہیں ؟
میری افسردہ نگاہی ، مری آہوں کا سبب؟

ساتھ ہی تم نے یہ دریافت کیا ہے مجھ سے
دل کہیں میرا اسیرِ غمِ الفت تو نہیں ؟
میرے اشکوں کا سبب کیا کوئی "افسانہ" ہے؟
میری آہوں کی جلو میں کوئی "صورت" تو نہیں؟

اے مرے دوست ہے احسان تمہارا مجھ پر!!
رنج تم نے جو میرے دل کا بٹانا چاہا
جس کے شعلوں کی مری روح تک آنچ آتی ہے
تم نے اس آگ کو دامن سے بجھانا چاہا۔

یہ سسکتے ہوئے لاشے یہ تڑپتے اجسام !
سچی خوشیوں سے ہیں محروم نہ جانے کب سے؟
بھوک کی آگ میں جلتے یہ کروڑوں انسان!
ان کی تسکین ہے معدوم نہ جانے کب سے ؟

بوریا تک بھی میسر نہ کسی کو آئے....
اور کوئی ریشمی گدوں پہ مزے سے سوئے
"ہیپی برتھ ڈے" کے کہیں نعرے لگیں، کیک کٹے
چپکے چپکے کوئی فاقوں کا ستایا روئے

اک طرف غم کا اندھیرا ہے مصیبت کے گڑھے
اک طرف روشنی، دلچسپ فسانوں کا نگر
اک طرف بھوک سے مرتے ہوئے مفلس انسان
اک طرف "کانٹی نینٹل" میں رئیسوں کا ڈنر

ہر طرف دھاندلی کا دور جب نظر آئے
میری آنکھوں میں جلیں کیسے مسرت کے دیئے
زندگی جبر ہے، خوشیوں پہ لگے ہیں پہرے
میرے ہونٹوں پہ ہنسی آئے تو آئے کیسے

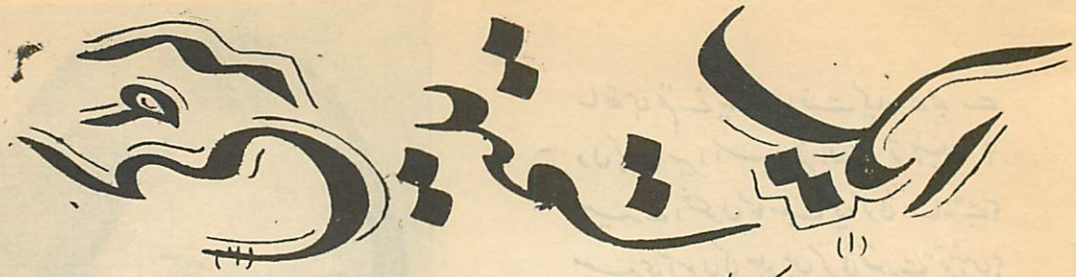

(۱)

اسے بوڑھے ماں باپ کیسے پکاریں
وہ مٹی کی خوشبو میں سوئے ہوئے ہیں
خدا کی حضوری میں ان کا مکاں ہے
وہ جنت کی خوشیوں میں کھوئے ہوئے ہیں

(۲)

زمیں بے سہاروں کا دوزخ نہیں ہے
اسی واسطے اس پہ سب مہرباں ہیں
خدا کی حکومت میں ہر بے زباں کو
میسر خوشی کے ہزاروں جہاں ہیں

(۳)

خدا اس کو مشرق کے زنداں سے لایا
کہ مغرب کی مٹی سے اس کی نمو ہو
وہ زمزم کے پانی سے دنیا سنوارے
جدھر رُخ کرے روشنی روبرو ہو!

(۴)

محبت کے دعوے بڑے ناروا ہیں
قیامت ہے قربت میں محرُوم رہنا
جوانی کے شعلے کو دل میں چھپا کر
کٹھن ہے تمنا کا مفہوم کہنا

(۵)

یہی سوچ کر شہرِ دوزخ کے حاکم
اسے اپنے کم خواب کمرے میں لائے
اسے قمقموں کا تماشہ دکھایا
طلسمی مشینوں پہ گاتے سنائے

(۶)

کہا — جسم سورج ہے اس پر گہن کیوں
لباس اور کپڑوں کے بادل ہٹا دے
مجاز اور حقیقت کے ہم پاسباں ہیں
خدا کے لئے اپنی صورت دکھا دے

(۷)

کوئی ابر دیکھے، کوئی چاند دیکھے
کسی نے نہ اسے سات عالم میں دیکھا
خدائی کے پردے میں اس کی ادا کو
فقط آشنا لفظ ظالم میں دیکھا

(۸)

ہزاروں کے قبضے سے کیسے بچے وہ؟
وہ بے آسرا ہے وہ بے خانماں ہے
خدا کی حکومت میں کمرے کے باہر
مصیبت کی تمثیل سارا جہاں ہے

(۹)

اسے میں نے کل شہرِ دوزخ کے باہر
صداؤں کی آندھی میں بیمار دیکھا
لباس اس کا حرمت کی چادر نہیں تھا
بدن اس کا چلنے پہ قادر نہیں تھا

میں کیسے بتاؤں کسے میں نے ظاہر
کسے میں نے در پردہ یوں خوار دیکھا

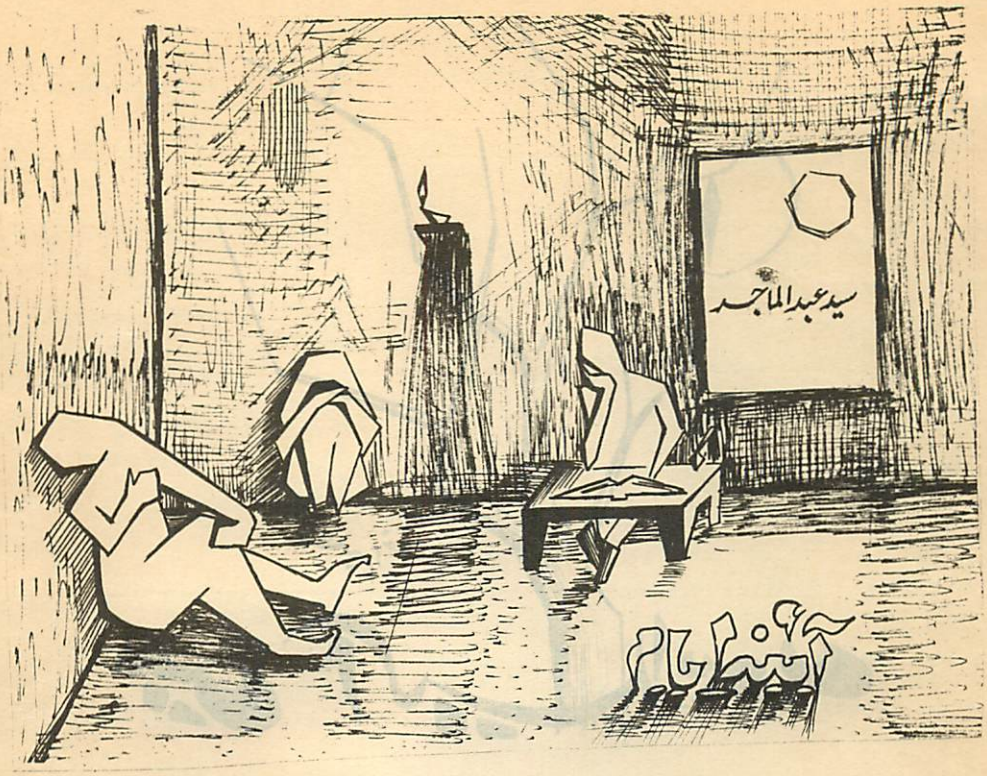

ہر طرف ہے چاندنی پھیلی ہوئی مہتاب کی
سسکیاں لیتی ہوئی ہوا چل رہی ہے برسات کی
آشیانوں میں ہیں اپنے سو رہے پیارے پرند
اور دریا کے کنارے ہیں پڑے سائے چرند
ہے سکوت مرگ طاری بلبلیں خاموش ہیں
سارے انساں نیند کی دیوی سے ہم آغوش ہیں
دور دیکھو جرس رک رک کے دیتا ہے صدا
جا رہا ہے سوئے منزل قافلہ بڑھتا ہوا
چاند اک دم بادلوں کی اوٹ میں گم ہوگیا
اک گھڑی کو سارا عالم رات میں ہے کھوگیا
اس سہانی رات کے طلسم کدے سے بے خبر
اک طالبعلم ہے جو جاگتا ہے رات بھر

جس کے چہرے سے ہزاروں درد کے نشتر عیاں
آنکھیں اندر کو دھنسی ابھری ہوئی ہیں ہڈیاں
اک کونے میں بہن سکڑی پڑی ہے سردے
پاس بوڑھا باپ بھی کرا رہا ہے درد سے
باپ کی بے نور آنکھوں کا ستارہ ہے یہی
بہن کی امید کا واحد سہارا ہے یہی

بہن کی بھی فکر ہے اور باپ کا بھی ہے خیال
اور خستہ جان ہو رہا ہے غم سے خود نڈھال
انسانیت سوئی کہاں ہے ذرا سا تو ہوش کر
دے رہی ہے درس اس ناتواں کو یہ کتاب
درد تجھ کو اس زمانے میں ملیں گے بے حساب
ان دکھوں کی آگ میں پک کر جو کندن ہوگیا
نام ازل تک رہا فنا چاہے بدن ہوگیا

شمیم اختر

میں اکیلا ہوں

چاندنی نرم ہے شبنم کی طرح
زندگی خاموش ہے پتھر کی طرح
رات سرد ہے اور دل سلگتا ہے
دھیمے دھیمے شبِ فراق کی مانند
میں اکیلا ہوں زرد رو چاند کی طرح
مگر نہیں ـــــ وہ کون ہے ؟
میری ہی طرح تنہا
اس کی آنکھوں کی اداسی کہتی ہے
چاند کی زرد روشنی
اس کی آنکھوں میں بھی چبھتی ہے!

میں بڑھا اور کہا ـــــ آؤ چلیں
چاندنی ہماری نہیں
نہیں نہیں! ـــــ مگر تم کون ہو؟
میں اکیلا ہوں زرد چاند کی طرح
لیکن یہ منتظر آنکھیں اور ـــــ
پلکوں سے ستارے گرے ٹوٹ گئے
میں بڑھا اور کہا ـــــ انتظار کیا معنی ؟
ان آنکھوں کا اب کوئی خریدار نہیں۔
نہیں نہیں ـــــ مگر تم کون ہو ؟
میں اکیلا ہوں زرد چاند کی طرح
مگر یہ دھواں کہاں سے اٹھتا ہے۔
شاید میری طرح اپنے احساس کی آگ میں

کوئی دھیمے دھیمے سلگتا ہے
میں بڑھا اور کہا ـــــ آؤ چپ چاپ جل جائیں
کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں
نہیں نہیں ـــــ مگر تم کون ہو؟
ان آنکھوں کی اجنبیت سے گھبرا کے میں جو پلٹا
آئینہ گرا اور گر کے ٹوٹ گیا
میں کون ہوں میں نہیں جانتا
میرا "میں" تو مجھ کو نہیں پہچانتا
اب میں اکیلا نہیں
میں مسکرا رہا ہوں
مگر دل سلگتا ہے آہستہ آہستہ۔

اجمل نیازی
مدثر ایم ڈار
مرزا محمد مجاہد
فاطمہ شہلا حسنین
شمیم اختر
انجم سلیم طلعت

زلف گرہ گیر کا اسیر

مدثر ایم ڈار

اس بات کا علم کہ عفو بھائی ہمارے دور کے کزن ہیں ہمیں عرصہ ۱۹ سال بعد ہوا جب ہم نے پنجاب یونیورسٹی میں فلسفہ کی آنرز کلاس میں داخلہ لیا۔

پہلے دن آنکھیں پھاڑ کر بلکہ اچھا خاصا پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے. جیسے ، ہم یہاں نئے آئے ہوں (اب آپ سے کیا پردہ۔ ہم یہاں داخلہ لینے سے پہلے بھی چکر لگایا کرتے تھے).

خیر صاحب اسی جانی پہچانی جگہ میں جان بوجھ کر اجنبی بنکر ادھر ادھر کی خاک کوڑی صفائی اور احتیاط سے چھان رہے تھے اور یہ بھی کوشش رکھی کہ یہ چھنتی خاک کسی کو ناگوار خاطر نہ گزرے۔ نہایت احتیاط کے باوجود ایک معزز سا ہاتھ ہمارے کندھے پر پڑا۔ مڑ کر دیکھا۔ با خدا بالکل ناشناسا چہرہ تھا۔ اُن محترم سے عرض کی " جی فرمائیے"

انہوں نے سوال کر ڈالا کہ اب جبکہ آپ اتنے بڑے ہو گئے ہیں اور ماشاء اللہ (طنز و محبت کے ملے جلے لہجے میں) یونیورسٹی میں بھی آ گئے ہیں تو اگر میں دانستہ طور پر غلطی نہیں کرتا تو میرا خیال ہے آپ کا کوئی اچھا سا نام بھی ہو گا؟ عجیب غیر شاعرانہ سوال تھا۔ جواب دیا خادم کو محمود کہتے ہیں۔

چمک کر بولے "خادم"، واللہ معلوم ہوتا ہے آپ کا تعلق لکھنؤ کے کسی خود ساختہ نواب خاندان سے ہے۔ بھئی واہ کیا طرز تکلم ہے کہ دل باغ باغ ہو گیا۔ اس بات پہ ہم بہت کسمسائے لیکن سوچا کہ بچو جی زیادہ چوں چوں کی تو سمجھو مارے گئے (اس اثنا میں اُن کے چند دوست آ گئے) کہا "جناب لکھنؤ تو ہم نے خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ خالص لاہور کے ہیں لاہور کے۔ چوہدری ہیں چوہدری —— "چوہدری سننا تھا کہ جیسے انہیں کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ چہرے پہ ایک اپنائیت کا نور سا چمکنے لگا۔ کہنے لگے —— " یار چوہدری ہو کر تو نے مجھے پہلے نہ بتایا اور دیکھو تمہیں جو میں نے پہلی نظر دیکھا تو اپنا اپنا لگا۔ پھر یار نہ چاہتے ہوئے بھی بلکہ یوں سمجھو کہ عادت سے مجبور ہو کر جی چاہا کہ ذرا چھیڑ خانی ہو جائے۔" غرض صاحب یہ تھا ہمارا عفو بھائی سے پہلا تعارف!

عفو بھائی ہم سے پورا ایک سال سینئر تھے (کہنے والے کہتے ہیں کہ انھیں اپنے موجودہ سینئرز کا بھی کسی زمانے میں سینئر ہونے کا شرف حاصل تھا) جس ماہ ہم نے داخلہ لیا۔ اس سے اگلے ماہ ان کا سپلیمنٹری امتحان تھا۔ لیکن صاحب مجال تھی جو عفو بھائی کسی دن یونیورسٹی

سے غیر حاضر ہوں وہ الگ بات ہے کہ کلاس اُن کی اِن دنوں کوئی نہ ہوتی تھی۔ امتحان شروع ہونے سے ایک دن پہلے تک آتے رہے۔

اُس دن نہایت سنجیدگی سے مجھے کہا کہ کل میں شاید کیمپس نہ آ سکوں۔ وہ ذرا پرسوں پیپر ہے۔ خیال ہے اب کچھ تیاری کر لی جائے۔ خیر صاحب عفو بھائی نے امتحان دیا اور خوب دھوم دھڑکے سے دیا۔ جس دن پیپر کر آتے تو فرماتے کہ صاحب تعلیم کا معیار زوال پذیر ہے پنجاب میں۔ اجی اتنے آسان پرچے کہ بس یوں سمجھئے کہ ہنسی آتی تھی۔ سوال پڑھ پڑھ کر کہ کیا جواب لکھا جائے۔ فسٹ کلاس پیپر کئے ہیں۔ تباہ کن۔ ہم نے جو یہ سنا تو خاصے امپریس ہوئے۔ لیکن ایک عجیب بات محسوس کی کہ جو بھی ان کی یہ لن ترانی سنتا، مسکرائے بغیر نہ رہتا۔ امتحانات ختم ہوئے تو عفو بھائی پھر اپنے پرانے دیس میں لوٹ آئے نتیجے کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اگر DISTINCTION نہ لی تو بہر حال DIV. 1ST تو کہیں گئی نہیں۔ ٹک شاپ میں لڑکوں کے ساتھ ایک ایک سوال پر کمال اعتماد کے ساتھ بحث کرتے۔ جیسے پریس کانفرنس کر رہے ہوں

اللہ اللہ کر کے نتیجہ آ گیا۔ اور پھر — پھر یہ کہ ہم ناچیز کو عفو بھائی جیسے عظیم فلاسفی طالب علم کا ہم جماعت ہونے کا شرف نصیب ہوا۔ لوگ ہمارے نصیب پر رشک کرتے (شاید کچھ اس حسد میں جلتے بھی ہوں) اور آ آ کر گلے لپٹ لپٹ کر ہمیں مبارکباد دیتے کہ کیا ہم اور کہاں یہ عظیم سعادت جو ہمیں نصیب ہوئی۔ عفو بھائی تھے کہ نتیجہ انھیں بالکل پسند نہ آیا۔ کہنے لگے سراسر غیر رومانٹک رزلٹ ہے۔ اور تو اور SUSPENSE بھی گھٹیا قسم کا ہے۔ اور جہاں تک ہمارے فیل ہونے کا تعلق ہے اسکے پیچھے ملکی پیمانے پر سازش کی گئی ہے۔ ہم سے استفسار کیا کہ تم ہی بتاؤ کہ پاکستان میں کون چاہتا ہے کہ یہاں پر عظیم فلسفی پیدا ہوں اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو مجھے فیل کئے دیتے ہیں.

اب تو ماشاءاللہ ہمارا اور عفو بھائی کا ۔وزکا ملتا تھا۔ ایک مضمون ایک کلاس اور ایک یونیورسٹی۔ ایک دن صبح ہی صبح کیمپس میں انھیں نہایت بے چینی کے عالم میں اِدھر اُدھر گھومتے پایا۔ اُن کا سراپا ایک تجسس کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔ ہم نے انہیں جو اس حال میں دیکھا تو آواز دی

"عفو بھائی خیریت" یہ آواز سننا تھا کہ وہ ہماری طرف اس طرح لپکے کہ جیسے روزِ ازل سے انہیں ہمارا انتظار تھا۔ کہنے لگے — یار عجیب نالائق انسان ہو کہاں انتقال کر گئے تھے۔ صبح سے پاگلوں کی طرح تلاش کر رہا ہوں اور ایک آپ ہیں کہ محبوب کے گھر کی طرح مل ہی نہیں رہے۔" اُن کا یہ حال ہم سے دیکھا نہ گیا اور عرض کیا۔" فرمایئے خیریت تو ہے۔" صاحب خیریت کیا ہوتی۔ انہوں نے کہیں کل بیٹھ کر چار گھنٹے کی مسلسل اور جاں گسل تحقیق کے بعد ایک DISCOVERY کی تھی کہ ہم دور سے اُن کے کزن لگتے ہیں۔ کیونکہ ہم بھی چودھری اور وہ بھی۔ اور اس ناگہانی ڈسکوری کے بعد انہوں نے ہمیں بے ساختگی سے اپنے سینے سے لگا لیا اور نہایت محبت سے بھینچا اور آہستہ سے میرے کان میں کچھ فلمی ڈائیلاگ بولے۔

پھر اس خوشی میں انہوں نے ہمیں یونیورسٹی ٹک شاپ سے ایک ملائی والی چاء اور چار آنہ نقد والا (نقد والا اس لئے کہ وہاں ہمیشہ ان کا اُدھار ہی چلتا تھا) پیٹیز کھلایا۔ اور یقین مانئے کہ اسی دن کلاسز ختم ہونے سے پہلے پہلے پورے کیمپس کو اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ عفو بھائی کا ایک کزن بھی یہاں پڑھتا ہے۔

ہماری کلاس میں ۱۳ لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ چند ایک تو اچھی خاصی خوش شکل بلکہ خوبصورت بھی۔ اور باقی بس SO , SO ہی تھیں۔ ابھی کلاسیں شروع ہوئے سارے دو مہینے تو ہوئے تھے۔ سلام دعا سے آگے بات نہ بڑھ پائی تھی۔ اور وہ بھی گنتی کے چند حضرات کے ساتھ عفو بھائی لڑکیوں کو (بقول ان کے) بالکل لفٹ کرانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ کلاس سے حسبِ عادت غائب ہوتے اور اگر کبھی غلطی سے آنا ہوتا تو میرے ساتھ سب سے آخری بینچ پر بیٹھتے اور دل پہ جبر کر کے لیکچر سماعت فرماتے۔ لڑکیوں کے بارے میں ہم نے عفو بھائی کو بہت تاؤ اور غیرت دلائی۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے ایک نئی اور دلچسپ توجیح پیش کی۔ ان کے فلسفہ کی رو سے ۱۳ کا لفظ نہایت منحوس تھا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ بخدا جس دن ان تیرہ میں سے ایک کم ہوئی یا ایک کا اضافہ ہوا میں اپنا مشن شروع کر دوں گا۔ اس کے بعد ہم ہر لمحے خدا سے دعا مانگتے کہ وہ اپنی بیکراں رحمتیں عفو بھائی پر

نازل فرمائے اور ان کے مشن کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو دور کرے۔
کسی دانا نے سچ کہا ہے کہ اوپر دیر ہے اندھیر نہیں۔ ایک سانولی سی
خاتون کراچی یونیورسٹی سے مائیگریشن کرا کے ہماری کلاس میں آگئیں
ہمیں جو علم ہوا تو ایک مدھم مدھم سی مسرت کی لہر سر سے لے کر پاؤں تک پاس
اون ہوگئی۔ عفو بھائی کو مطلع کیا گیا۔ انہیں ان کا وعدۂ پارینہ یاد کرایا گیا۔
مشن کی اہمیت کا احساس دلایا۔ انہوں نے نہایت ناصحانہ انداز میں کہا "یار
کیوں سوتے شیروں کو چھیڑتے ہو" ایک دفعہ موج میں آگئے تو جانو کرشامت
آگئی۔ مزید اطلاع ہمیں بہم پہنچاتے ہوئے کہا کہ میاں تم تو اس سال
یہاں آئے ہو خادم کو یہاں کا طویل تجربہ ہے۔ لڑکیاں! ان کا کیا ہے
ابھی پچھلے سال کی بات ہے ہماری کلاس (یعنی وہ کلاس جو اب ان
سے ایک سال سینئر تھی) میں نو لڑکیاں تھیں۔ بخدا اگر کبھی ان کے
ساتھ ملنے کا اتفاق ہو جاتا تو جتنی دیر میں وہاں کھڑا رہتا۔ کم بخت ٹلنے
کا نام نہ لیتیں۔ جہاں چلنے کو قدم اٹھایا۔ ان میں کسی نے ایک ادائے بے
قراری سے کہا عفو صاحب اتنی بھی کیا جلدی۔ اور کوئی بات سنائیے۔
اور یقین مانو میں نے یہاں تک سنا کہ ان نیک بیبیوں میں سے چند
ایک کی میرے بارے میں آپس میں کافی گرما گرم جھڑپیں اور کبھی کبھار
ہلکے پھلکے پرگولہ باری بھی ہوتی رہی۔

ایک دفعہ چھانگا مانگا پکنک منانے گئے۔ وہاں ہر لڑکی اس بات
پر مصر کہ میں اس کے ساتھ کشتی میں جھیل کی سیر کروں۔ ہر ایک کو اصرار کر ان
کے ساتھ اچھے سے پوز میں ایک فوٹو اتروائی جائے اور اس طرح ایک اچھی
خاصی تفریح کا ستیاناس ہوگیا (ہائے بے چارے عفو بھائی۔ لڑکیوں
کو تو ذرا بھی خیال نہیں تھا ان کی طبع نازک کا) آپ جانیے کہ ہم نے یہ
سب سنا تو ہمیں عفو بھائی اپنے سامنے ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی طرح
بلند دکھائی دیئے۔ (ویسے اس وقت دل بہت چاہا کہ ان سے پوچھا
جائے کہ جو لڑکیاں پچھلے سال تک ان پر سو جان سے واری تھیں اب
ان کو کیا ہوا) شاید عفو بھائی ان سے جونیئر تھے اور وہ جونیئر کو نفٹ
نہ کرانے کی روایت کو توڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ یا عفو بھائی میں انھیں
جو آئیڈل نظر آیا تھا وہ کہیں پرواز کر گیا۔ لیکن ہم یوں عفو بھائی کو
خفا کرنے کا خطرہ خواہ مخواہ مول لینے کے موڈ میں نہیں تھے۔

اسی اثنا میں ہماری کچھ اور حضرات سے بھی دوستی کی حد تک راہ و
رسم پیدا ہوگئی۔ خاص کر ماجد کے بارے میں مجھے یہ احساس ہونے لگا۔
کہ مجھے ایک اچھا دوست مل گیا۔ کلاس میں ہم عموماً اکھٹے بیٹھتے اور جس
دن عفو بھائی کلاس میں نازل ہوتے تو وہ بھی ہمارے ساتھ ہی بیٹھتے۔ ہمارے
خیال میں یہ سراسر ان کی عنایت تھی۔ اول تو یہ ان پر لازم نہ تھا کہ وہ
کلاس میں تشریف لائیں۔ یوں کبھی کبھی وارد ہونے کے بارے میں ان
کا اپنا ایک فلسفہ تھا۔ ان کے خیال میں اس طرح اجنبیت دور کرنے
میں مدد ملتی۔ اور دوسرے چھوٹی سی کلاس تھی اور کمرہ کافی بڑا تھا جہاں
چاہتے بیٹھ سکتے تھے۔

ماجد کی ایک کزن بھی وہیں کیمپس میں زیر تعلیم تھیں مضمون ان
کا تھا انگلش لٹریچر چونکہ بہاول پور سے آئی تھیں۔ اس لئے یونیورسٹی
کے ہوسٹل میں مقیم تھیں۔ ماجد اگر کبھی انہیں ملنے جاتا تو ہمیں بھی ساتھ
لے چلتا۔ نام ان کا سنجیدہ خانم تھا لیکن طبیعت بالکل برعکس پائی
تھی۔ آنکھوں میں شوخی کی بے چین لہریں اور ذہن ہر لحظہ نئی شرارتوں
کے لئے تیار۔ جلد ہی اُن سے تکلف جاتا رہا۔

ایف۔ اے کرنے کے بعد خواہ مخواہ بھائی جان کے ساتھ ضد میں
آکر فلسفہ میں آنرز کا پروگرام بنا لیا تھا۔ خیال تھا کہ مضمون کافی
دلچسپی کا حامل ہوگا اور سچ پوچھیں تو داخلہ لینے سے پہلے ہمیں اتنا
خیال تھا کہ فلسفہ اس قسم کی چیزوں سے بحث کرتا ہے کہ یہ آلو نیلا
کیوں ہے؟ اگر یہ نیلے کی بجائے نارنجی رنگ کا ہوتا تو کیا ہوتا اور اگر
یہ آلو ہی نہ ہوتا اور اس کی جگہ کریلا زمین سے اُگتا تو اس کی وجوہات کیا
ہوتیں۔ اگر واقعی وہ کریلا ہوتا اور نیم چڑھا ہونے کی بجائے میٹھا ہوتا تو
کیسا رہتا اور اگر میٹھا ہی ہونا تھا تو وہ کریلا کیوں ہوا اس کی جگہ
گنا بھی اُگ سکتا تھا۔ لیکن گنا زمین کے اوپر اگتا ہے اور کریلا
بیل کے ساتھ لٹکتا ہے اور چونکہ گنا بیل کے ساتھ نہیں لٹک سکتا
لہذا وہ کریلے کی جگہ نہیں اُگ سکتا اور چونکہ آلو زمین کے اندر پیدا
ہوتا ہے اور تھوڑا بہت میٹھا ہوتا ہے لہذا وہ کریلا نہیں ہو سکتا۔
اور چونکہ اس کا تعلق نارنگی کی فیملی سے نہیں لہذا نارنجی رنگ کا
نہیں ہو سکتا تو ثابت ہوا کہ اگر آلو نیلا ہے تو اس میں کچھ ایسی

فاش غلطی بھی نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ سب قیاس فی خیالِ خام سے زیادہ کچھ نہ ثابت ہوئے جب سر پہ پڑی تو ہمیں معقول شخص کی طرح نانی مرحوم کی یاد نے بہت ستایا۔ بخدا فلسفہ کے لیکچر اس قدر خشک۔ ثقیل اور فلسفیانہ ہوتے ہیں کہ ہضم کرنا تو رہا ایک طرف نگلنا مشکل ہے۔ تمام رنگین و حسین محل (جن میں اصولاً پریوں کا بسیرا ہونا چاہیئے) فلسفہ کے گہرے اور دبیز اندھیروں میں بھوتوں کا مسکن دکھائی دینے لگے۔ مضمون اب بدل نہ سکتے تھے کہ پڑھا نہ جاتا تھا۔ بس حال کچھ ایسا تھا کہ

اے غمِ دل کیا کروں
اے وحشتِ دل کیا کروں

ادھر ماجد کا بھی کم و بیش یہی حال تھا بلکہ اس بے چارے کے ساتھ یہ ٹریجڈی تھی کہ اس کے ابا حضور فلسفہ میں ایم اے تھے۔ اور نہایت باقاعدگی کے ساتھ ہر رات کو اختر شماری کرتے ہوئے تاروں کی ہیئت کے فلسفہ وغیرہ پر بحث کرتے۔ (عموماً بحث کا موضوع جیسا کہ ماجد نے بتایا اس قسم کا ہوتا کہ اگر یہ تمام بکھرے ہوئے تارے اکھٹے ہو کر ایک جگہ جمع ہو جائیں تو چاند کی کافی ہیٹی ہو۔ لیکن سارا مسئلہ یہ تھا کہ تاروں کو سمجھائے کون۔

آخر کار ہم نے اس ہمہ وقت بوریت سے بچنے کی ترکیب ڈھونڈ نکالی کہ عفو بھائی کو گرمی دلا کر کلاس کی کسی خاتون سے عشق کرنے پہ مجبور کیا جائے اور پھر ان کی حماقتوں کی گدگدیوں سے تھکے وقت کو ہنسایا جائے۔

اس سلسلے میں کافی غور و خوض کیا گیا۔ ہر پہلو پہ رائے زنی کی گئی۔ ماجد کا خیال تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو آنسہ سنجیدہ خانم کی خدمات بھی مستعار لی جا سکتی ہیں۔ خیر صاحب یہ فیصلہ ہوا کہ کل عفو بھائی کا "گھیراؤ" کیا جائے اور انھیں شرم۔ غیرت یا چار سو بیسی غرض کسی طور وادیٔ عشق میں قدم رنجہ فرمانے پہ مجبور کیا جائے۔

نیک بندوں کے ساتھ آپ جانیں ویسے بھی اللہ کی مدد شاملِ حال ہوتی ہے۔ عین پروگرام کے مطابق دوسرے دن صبح ہم کلاس سے "پھوٹے"۔ اور عفو بھائی کو ٹک شاپ میں جا لیا۔ عفو بھائی ہمیں دیکھ کر بہت حیران ہوئے (ہمارے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ہم بہت ندیدے واقع ہوئے ہیں اور ہر پیریڈ اٹینڈ کر کے فیس کے پورے پیسے حلال کرتے ہیں) لیکن خوشی ان کے چہرے پہ نمایاں تھی۔ چائے منگوائی گئی ہم نے ماجد کو آنکھ ماری اور اس کے ساتھ ہی ادھر اُدھر کی گفتگو کے دوران نہایت چابکدستی سے دونوں پہلوؤں سے عفو بھائی پر حملہ شروع کیا گیا۔ ہم نے نہایت بے تکلفی سے سرِ راہ ذکر کیا کہ "عفو بھائی آپ نے غور کیا یہ لڑکیاں آجکل بہت خود سر ہو رہی ہیں مجال ہے کہ کلاس میں کسی کے سوال کا جواب دے دیں۔ ہر ایک اپنے آپ کو لیڈی سمجھتی ہے۔" (عفو بھائی نے اچانک کرسی پہ کروٹ بدلی)۔

"شکل تو دیکھو کہ اگر رات کو خواب میں تشریف لے آئیں تو باقی رات ڈرتے ہی گزرے۔" (وہ ذرا سا مسکرائے) ماجد نے ہمیں یہاں پروگرام کے مطابق ٹوکا۔ "نہیں پارٹنر بعض تو واقعی اچھی ہیں بھئی لڑکے بھی تو نہایت جفا دری ہیں۔ ایک سے ایک نکما۔" (عفو بھائی کے چہرے پہ بوریت اور مائینڈ کرنے کے تاثرات) "لڑکیوں کا دماغ چل گیا ہے جو خواہ مخواہ منہ لگاتی پھریں۔" ہم نے فوراً کہا۔ "ماجد خیر یہ بھی جانے دو۔ اچھے لڑکوں کی کیا کمی ہے۔ ہمارے عفو بھائی کیا کسی سے کم ہیں؟ بس ذرا شرافت ہے جو دبائے رکھتی ہے ورنہ یہ اشارہ کریں تو لڑکی فریفتہ ہو جائے۔"

ماجد نے (عفو بھائی کو تاؤ دلانے کے لئے) ناک چڑھا کر کہا۔ "بخدا اچھی گپ مار لیتے ہو۔ جس دن ان سے کوئی کلاس کی لڑکی پھنس گئی الٹے استرے سے سر منڈوا دوں گا۔" تیر نہایت صحیح نشانے پر لگا تھا۔ عفو بھائی تلملا کر بولے۔ "میاں ماجد قسم ہے پیدا کرنے والے کی۔ اب تمہارا سر عنقریب ایک ٹنڈ میں منتقل ہونے والا ہے۔ ابھی میں کہتا ہوں نام تو کسی کا۔ اور دیکھو یوں (چٹکی بجاتے ہوئے) پھنسا تا ہوں یوں۔"

میری تجویز پہ تمام چودہ لڑکیوں کے ناموں کی پرچیاں لکھی گئیں اور قرعہ نکالا گیا۔ آپ مانیں نہ مانیں قرعہ انہیں محترمہ کے نام کا نکلا جو کچھ عرصہ پہلے کراچی یونیورسٹی سے آئی تھیں۔ ان کا بڑا پیارا سا نام تھا مس شرمیلی بندوق والا (کیسا؟) عفو بھائی تو فوراً ہی مشن کی بسم اللہ کے لئے تیار تھے۔ لیکن ہم نے معاملہ پیر تک ملتوی کرا دیا تاکہ عفو بھائی کو

پلاننگ کے لئے مناسب موقع مل جائے۔

مس بندوق والا گرلز ہوسٹل میں رہا کرتی تھیں۔ اور ان کا کمرہ سنجیدہ کے کمرے کے آس پاس تھا۔ مضامین دونوں کے مختلف تھے لیکن لڑکیاں ہی تو تھیں۔ اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ اور کسی حد تک ایک دوسرے کی رازدار بھی بن گئیں۔ ان کے اچھے تعلقات دیکھ کر امید ہو چلی تھی۔ کہ اگر کبھی (عفو بھائی کیس) میں سنجیدہ کی مدد لی گئی تو لطف دوچند ہو جائے گا۔

پیر کو عفو بھائی لان میں ایک بنچ پر بیٹھے کتاب کا مطالعہ فرماتے نظر آئے۔ دور سے (پہلی مرتبہ) کافی معقول سے دکھائی دیئے۔ قریب جاکر سلام کیا بہت روکھا سا جواب ملا۔ غیر متوقع جواب پاکر کافی بوریت ہوئی اور ہم وہاں سے چپکے سے چلے آئے۔

مس بندوق والا اچھی خاصی ریگولر اور پڑھاکو ٹائپ خاتون تھیں۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ فیشن سے بھی ان کا شغف ان کے لباس اور ہیئر سٹائل سے ظاہر ہوتا تھا۔ رنگ اگرچہ سانولا تھا۔ لیکن نقش اتنے بُرے نہ تھے۔

عفو بھائی کی ناراضگی کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔ یونیورسٹی میں وقت کافی دقت سے کٹا۔ شام کو ہم عفو بھائی کے گھر گئے۔ اپنی دور کی خالہ یعنی عفو بھائی کی والدہ کو سلام عرض کیا۔ اور عفو بھائی کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ حضرت کل سے پریشان پریشان ہیں اور یونیورسٹی سے آکر سیدھے کمرے میں گھس گئے ہیں۔ (قاعدے کے مطابق انہیں اس وقت مال روڈ ناپتے یا انارکلی میں بے مقصد چاٹ کھا رہے ہونا چاہئے تھا) ہم نے جی میں کہا "خیر ہو" اور انھیں کمرے میں جا لیا۔ وجہ ناسازیٔ موڈ دریافت کی۔ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر نہایت پُراسرار دھیمی آواز میں فرمایا کہ اس ایک نامعقول لڑکی کے پیچھے اپنی برسوں پرانی سہیلیوں سے قطع تعلق کرنا ہوگا اور یہ سب سراسر تمہاری حماقت کی وجہ سے ہوگا۔ کل سے مسلسل یہی سوچ میرے دماغ کے گرد چکر پہ چکر لگا رہی ہے کہ نہ تم ماجد کو میرے ساتھ بحث میں الجھاتے نہ یہ خواہ مخواہ کی مصیبت گلے پڑتی۔

ہم نے نہایت شائستگی اور انکساری سے کئے کی معافی طلب کی اس پر انہوں نے ہمارا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا خیر جو ہوا سو ہوا اور ساتھ ہی مسکرا دیئے

دوسرے دن عفو بھائی پہلے پیریڈ ہی میں کلاس میں تشریف لے آئے کچھ لوگوں نے انہیں دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا لیکن ہم اور ماجد سمجھ گئے کہ عفو بھائی نے آج اپنی مسلسل غیر حاضری کا فیتہ کاٹ کر مشن بندوق والا کا افتتاح کر دیا ہے کلاس ختم ہوئی سب باہر نکلے۔ عفو بھائی ابھی تک خاموشی کو اپنے پر مسلط کئے ہوئے تھے ہم لوگوں کا خیال تھا کہ اس خاموشی میں کوئی طوفان پنہاں ہے اور وہی ہوا اچانک عفو بھائی آہستگی سے پتلے قدم بڑھاتے ہوئے مس بندوق والا کی طرف چلے (آپ نے کبھی بلی کو آہستگی سے چوہے کی طرف بڑھتے دیکھا ہے؟) ہم اور ماجد اگرچہ ان دونوں سے دور کھڑے تھے لیکن ان کی گفتگو سنی جا سکتی تھی۔ عفو بھائی جیسے ہی مس بندوق والا کے پاس پہنچے گلا صاف کرتے ہوئے کہا "ایکسکیوزمی" بندوق والا نے گردن ترچھی کر کے دیکھا انہوں نے کچھ کہا جو ہم سن نہ سکے اب عفو بھائی کی باری تھی کہنے لگے "آپ نے آج کلاس میں لیکچر کے پوائنٹس تو لکھے ہوں گے وہ۔۔۔" بندوق والا نے انہیں درمیان میں ٹوکتے ہوئے کہا "مسٹر آپ ہیں کون؟"

"جی! میں آپ ہی کا کلاس فیلو ہوں"

جواب ملا "کلاس فیلو" لیکن دیکھا تو نہیں آپ کو کبھی کلاس میں ویسے بھی آپ شکل سے سٹوڈنٹ سے زیادہ کچھ اور لگتے ہیں" عفو بھائی کے چہرے پر کچھ بوریت کے آثار پیدا ہوئے اگرچہ وار کاری تھا لیکن نہایت سکون سے سہہ گئے لیکن عفو بھائی بہرحال عفو بھائی تھے صفائی پیش کی کہ پچھلے دو ہفتوں سے بیمار تھے اور آ نہ سکے مس بندوق والا اسے سچ مان گئیں کچھ انگلش میں پوچھا عفو بھائی سمجھ نہ سکے بائیں ہاتھ کی انگلی سے ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے عرض مدعا کی "جی اگر آپ پچھلے نوٹس دے دیں تو عنایت ہوگی میرا بھلا ہو جائے گا تعلیم کا نقصان نہ ہوگا" ہائے قربان جاؤں عفو بھائی) خاتون نے شاید پوچھا کہ آپ کسی لڑکے سے کیوں نہیں مانگتے عفو بھائی نے نہایت اعتماد سے جواب دیا "دراصل لینے کو تو میں کسی لڑکے سے لے لوں پر آپ جانتی ہیں کہ کلاس میں بے ہودہ شعروں کے سوا کچھ نہیں لکھتے اور یا پھر پروفیسر کے کارٹون بناتے رہتے ہیں"۔ مس بندوق والا نے شاید پیچھا چھڑانے کے لئے اکھڑ لہجے میں کہا "اچھا کل لیتی آؤں گی" اس پر عفو بھائی نے تمام جذبات کو گلے میں جمع کر کے نہایت مدبرانہ طریقے سے کہا "شکریہ" وہ جانے لگیں تو عفو بھائی نے شائستگی سے آواز دی "مس بات سنئے" انہوں نے وہیں سے جواب دیا "فرمائیے کیا بات ہے؟" عفو بھائی نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا جی! وہ آپ کا نام" انہوں نے پوچھا "مجھے

کرتے تھے۔ ایک دن ہم نے پوچھا۔ کیوں عفو بھائی کہئے کبھی اُن" سے پھر بات ہوئی۔ یہ سن کر خاموش رہے۔ چہرے سے اداسی چھلک رہی تھی انہوں نے یہ معنی خیز شعر پڑھے۔

وہ شوخ شوخ نظر سانولی سی اک لڑکی
جو روز میری گلی سے گزر کر جاتی ہے
سُنا ہے وہ کسی لڑکے سے پیار کرتی ہے
بہار ہو کے تلاش بہار کرتی ہے

عفو بھائی کی آنکھوں میں گہری اداسیوں کی جھیل جھلملا رہی تھی آواز میں بلا کر درد تھا۔ عفو بھائی کی زندگی کا یہ سب سے انوکھا اور ناقابلِ یقین پہلو تھا۔ جو آج ہمارے سامنے آشکار ہوا۔ ورنہ اس سے قبل تو ہم یہ سمجھا کرتے کہ عفو بھائی مس بندوق والا کے سلسلے میں غیر سنجیدہ ہیں۔ ہم نے آہستہ سے پوچھا "عفو بھائی کیا۔ آپ سچ مچ ؟" اس کے جواب میں انہوں نے آہستہ سے گردن ہلا دی۔

عفو بھائی کی طبیعت میں شوخی اور لاپرواہی کی جگہ سنجیدگی اور تدبر نے لے لی تھی۔ ساری کلاس میں لے دے کے ان کی بس ہم سے دوستی تھی اب وہ کبھی کبھار کلاس میں تشریف لاتے۔ ہم نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔ "ان کو دیکھتا ہوں تو دل کو کچھ ہونے لگتا ہے"

اسی دوران میں مس بندوق والا اور پرنس یک جان دو قالب ہونے کی پیہم کوششوں میں مصروف تھے۔ اور بے چارے عفو بھائی اپنے غم سے دل بہلا رہے تھے۔ ہم نے ماجد کو سب سمجھا دیا اور اصرار کیا کہ وہ عفو بھائی سے اپنی شرط کے سلسلے میں بالکل گفتگو نہ کرے کہ یہ اُن کے لئے اچھا نہ ہوگا۔

ایک اتوار کی شام کو ہم گھر بیٹھے بور ہو رہے تھے سوچا عفو بھائی کے پاس چلا جائے۔ وقت ہی کٹ جائے گا۔ عفو بھائی کمرے میں لیٹے مجاز کا مجموعہ کلام "آہنگ" پڑھ رہے تھے۔ کمرہ نہایت بے ترتیب ہو رہا تھا۔ کتابوں پر دھول جمی ہوئی تھی اور ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرا پڑا تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ سب عشق کی کرامات ہیں۔ ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور مس بندوق والا کا ذکر چل نکلا۔ عفو بھائی بہت جذباتی انداز میں کہنے لگے۔ "تم کیا جانو وہ مجھے کسقدر حسین لگتی ہے۔ مجھے یاد ہے جب وہ میری کسی بات پر ہنس دیا کرتی تھی تو میں اُس کے گالوں کے ننھے ننھے ڈمپل کے بھنور میں خود کو کھوتا ہوا محسوس کرتا اور جب کسی بات پر حیران ہو کر اتنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلاتی تو میرا جی چاہتا اس کی گہری جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوب جاؤں۔ کئی دفعہ میں نے خیالوں میں اس کے نقرئی قہقہوں کی صدا سُنی ہے اور اب حالت یہ ہے کہ جو ہونٹ کبھی مجھے دیکھ کر چپکے سے مسکرا دیا کرتے تھے اب ان پر ایک زہر خند مسکراہٹ چھا جاتی ہے۔ اب میں جان گیا ہوں کہ اس زمانے میں دل کی وقعت راہ میں پڑے کنکر سے زیادہ نہیں جو چاہے اپنے پیروں تلے روند ڈالے۔ کاش میں یہ سمجھ جاتا کہ دنیا میں اگر کوئی چیز اہم ہے تو وہ مایہ ہے"۔ پھر انہوں نے پوچھا۔ بتاؤ خدا کے واسطے مجھے بتاؤ کہ یہ دولت آخر کیونکر دل کی قیمت سے زیادہ اہم ہے۔؟

دوسرے دن عفو بھائی کلاس میں آئے اور پھر ایسے گئے کہ تیسرے دن شکل دکھائی۔ ہم نے وجہ پوچھی تو بولے آج میری قسمت کا اہم فیصلہ ہونے والا ہے۔ ہم کچھ بھی سمجھ نہ پائے۔ کلاس کے بعد ہم نے وہ منظر دیکھا کہ ہمیں گمان ہوا کہ ہم خواب دیکھ رہے ہیں یعنی عفو بھائی نے تقریباً دس منٹ مس بندوق والا سے بات کی۔ جیسے ہی وہ رخصت ہوئیں ہم بھاگ کر عفو بھائی کے پاس پہنچے۔ اس سے قبل کہ ہم اُن سے کچھ پوچھتے۔ انہوں نے کہا میں نے انہیں ایک خط لکھا تھا۔ جس میں کوشش کی تھی کہ حالات سدھر جائیں۔ پھر ایک تہہ شدہ کاغذ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ یہ ان کا جواب ہے اور کہہ گئی ہیں کہ آئندہ اُن سے گفتگو کرنے کی تکلیف نہ کروں ورنہ صدرِ شعبہ کو شکایت کر دیں گے۔ ہم نے کانپتے ہاتھوں سے رقعہ کھولا۔ اُس میں لکھا تھا۔

مسٹر عفو!

نہ جانے آپ کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہیں۔ میرا خیال تھا۔ آپ کوئی معقول انسان ہیں۔ لیکن معاملہ برعکس نکلا۔ آپ نے اپنے خط میں جو مجھ سے

دوبارہ دوستی کی خواہش کی ہے۔ تو اس بارے میں میں یہ کہوں گی کہ اوّل تو آپ سے ہماری دوستی کبھی تھی نہیں۔ لہٰذا دوبارہ استوار کرنے کا کیا مطلب۔ اور دوسرے کبھی آپ نے اپنے بارے میں سوچا بھی ہے۔ کہ آپ کون ہیں؟ برائے مہربانی مجھے آئندہ تنگ نہ کریں۔ ورنہ نتائج کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔

شرمیلی بندوق والا

خط پڑھنے کے بعد ہم نے عفو بھائی کی طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں تارے جھلملا رہے تھے۔ انہوں نے ہم سے خط لیا اور بغیر کچھ کہے وہاں سے چل دیئے تھے۔

سالانہ امتحان نزدیک آ رہے تھے۔ ہر کوئی پڑھائی میں مشغول تھا۔ عفو بھائی بھی بظاہر اس دفعہ پڑھائی میں دلچسپی لے رہے تھے۔ لیکن ان کا اصل حال کم از کم ہم سے پوشیدہ نہ تھا۔ نظریات کے لحاظ سے وہ اچھے خاصے سوشلسٹ ہو چکے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے سرمایہ داروں کو گالی نکالتے اور لینن اور ماؤ کے افکار لوگوں کو سناتے رہتے۔ کہتے تھے "دولت سب برائیوں کی ماں" ہے۔ اگر کہیں سامنے سے مس بندوق والا نظر آ جاتیں تو یا راستہ بدل جاتے یا سر جھکا کر گزر جاتے۔

نہ جانے قدرت کو کیا منظور تھا۔ اچانک ایک صبح یہ خبر دہشت بن کر پوری کلاس میں پھیل گئی کہ مس شرمیلی بندوق والا اور پرنس دلبر جان کی منگنی ہو گئی ہے۔ سب لڑکے لڑکیاں انہیں مبارک باد دے رہے تھے۔ عفو بھائی ابھی یونیورسٹی نہیں پہنچے تھے۔ لہٰذا ہم پہلے ہی ڈیپارٹمنٹ کے باہر جا کھڑے ہوئے۔

جیسے ہی عفو بھائی دکھائی دیئے۔ انہیں آواز دے کر اپنے پاس بلایا۔ ڈرتے ڈرتے انہیں منگنی کی اطلاع دی۔ عفو بھائی بید کی طرح لرز کر رہ گئے انہوں نے بس اتنا کہا یا خدا یہ کیا ہو گیا۔ اور ہم سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئے۔ ہم انہیں آوازیں دیتے رہ گئے۔ کلاس میں بہت مشکل سے وقت کٹا۔ کلاس ختم ہوئی تو سیدھے عفو بھائی کے گھر پہنچے معلوم ہوا ابھی وہ گھر نہیں آئے۔ ہم نے سوچا راستے میں کہیں اٹک گئے ہوں گے۔ لہٰذا وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ مگر عفو بھائی نہ لوٹے۔

انکی والدہ بہت پریشان ہو رہی تھیں۔ رات اور پھر گہری رات ہو گئی۔ لیکن ہم سب کی کوشش کے باوجود عفو بھائی کہیں نہ ملے۔ ہم ماجد کے پاس ہوسٹل گئے۔ عفو بھائی کی گمشدگی کی خبر سنائی اور تمام ہوسٹلوں میں ایک کمرے میں انہیں تلاش کیا۔ لیکن انہیں نہ ملنا تھا نہ ملے تھانے میں رپورٹ کرا دی گئی۔ پولیس نے تمام ہسپتالوں سے معلوم کیا۔ لیکن عفو بھائی وہاں بھی نہ تھے۔ دل میں رہ رہ کے ہول اٹھ رہے تھے کہ خدا خیر کرے۔ تمام رات جاگتے گزاری۔

دوسرا دن اور دوسری رات بھی اسی طرح گزر گئی ان کے گھر والوں کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی کلاس میں بھی سب کو علم ہو گیا۔ سب نے اپنے اپنے طور پر تلاش کیا۔

اور

پھر تیسرے دن صبح روشن سورج کے ایک منحوس خبر لے کر طلوع ہوئی عفو بھائی کی لاش راوی میں بارہ دری کے پاس تیرتی ہوئی پائی گئی

خبر سنی تو یقین نہ آیا۔ آنکھوں سے ان کی لاش کو دیکھا تو جی میں آیا کہ آنکھیں پھوڑ لوں۔ یقین نہیں آتا تھا کہ عفو بھائی یہ کر گزریں گے۔ عفو بھائی دفن کر دیئے گئے۔ لیکن ان کی یاد آج بھی ہمارے دل اور روح میں رچی بسی ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

شرمیلی بندوق والا کہتے ہیں"، "بندوق والا"! عفو بھائی نے کہا "آپ کا سرنیم کتنا سویٹ ہے"۔ "شکریہ"! انہوں نے کہا اس سے قبل کہ وہ چلتیں عفو بھائی نے کہا "میرا اصل نام تو کچھ اور ہے ویسے سب مجھے عفو کہتے ہیں ــــــ آپ چاہیں تو ــــــ" وہ ان کی پوری بات سننے بغیر کتابیں سنبھالتی ہوئی وہاں سے چلدیں اور عفو بھائی ایک نیم فاتحانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے ہماری طرف آئے آگے بڑھ کر نہایت گرمجوشی سے ہم نے انہیں مبارکباد دی۔

مس بندوق والا وعدہ وفا کرنے کے موڈ میں تھیں اگلے دن نوٹس لیتی آئیں ہم نے عفو بھائی کو ان سے نوٹس لیتے نہیں دیکھا لیکن نوٹس بہرحال انہوں نے حاصل کر ہی لیئے اور یقین جانیئے کہ انہوں نے نوٹس کا کوئی نوٹس نہیں لیا مسلمانیت ان کی طبعیت میں جنم جنم کی رچی بسی تھی نوٹس کو وہ امانت سمجھتے تھے اور ایک مومن کی کیا مجال کہ امانت سے کوئی ذاتی فائدہ حاصل کرے۔ اس دن کے بعد عفو بھائی نے پانچ چھ روز اپنی شبیہہ مبارک کا دیدار نہ کروایا۔ مس بندوق والا ہر روز ہر پریڈ میں ادھر ادھر متلاشی نگاہیں دوڑاتی لیکن عفو بھائی شاید اعتکاف میں تھے۔

اسی اثناء میں ماجد اور ہم نے سنجیدہ خانم کو تمام حالات سے مطلع کر دیا جس دن عفو بھائی نے مس بندوق والا سے اپنا تعارف کروایا اسی دن سے وہ ON DUTY تھیں۔

ماجد اور ہم ایک شام گرلز ہوسٹل سنجیدہ سے اس طرف کی رپورٹ وصول کرنے جا دھمکے امید تھی کہ حالات اس طرف بھی کافی ابال کھا رہے ہوں گے سنجیدہ نے بتایا کہ مس بندوق والا اپنے نوٹس کے سلسلے میں کافی فکرمند ہیں عفو بھائی کے بارے میں ان کی ذاتی رائے ہے کہ نہایت غیر ذمہ دار اور نالائق شخص ہے ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر عفو بھائی کو اس افتتاحی بدمزگی سے حاصل کیا ہوگا لیکن پھر خیال آتا کہ نہایت گھاگ شاطر ہیں کوئی بہت دوررس چال چلی ہوگی۔

پیر کو کیمپس پہنچے تو دیکھا کہ عفو بھائی موجود ہیں عفو بھائی بند گلے کا سویٹر زیب تن کئے کھڑے تھے شیو بھی کچھ بڑھی بڑھی سی اس سے پہلے کہ حال پوچھتے انہوں نے بڑھ کر ہمارے بتا دیا اور کہا "حال میرا بالکل ٹھیک ہے باقی بعد میں"۔ کلاس کا وقت ہو گیا تھا ہم سب کلاس کی جانب چل دیئے۔

پیریڈ ختم ہوا تو مس بندوق والا جلدی سے عفو بھائی کے پاس پہنچی ہم بھی ساتھ ہی تھے ظاہر ہے انہوں نے اپنے نوٹس کے بارے میں پوچھا ہوگا۔

واہ رے ہمارے عفو بھائی وہ ایکٹنگ کی کہ جی چاہا کہ ان کا ایک فوٹو کسی اخبار کے فلم ایڈیشن میں "انہیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے" کے کالم میں چھپوا دیں انہوں نے فوراً اپنے اوپر پچھلے ہفتے ملیریا کا حملہ کروا دیا بڑھتی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "آنا تو میں چاہتا تھا لیکن جب بھی بستر سے اٹھا اس روز کئی چکر آئے کہ گھنٹوں ہوش نہ رہا لیکن آپ کو نوٹس واپس کرنے کا وعدہ کسی پل چین نہ لینے دیتا لہذا چلا آیا ہوں یہ لیجئے آپ کے نوٹس" عفو بھائی نے اکھڑی اکھڑی سانس سے کہا "اور شکریہ" پھر تھوڑا سا لڑکھڑائے (فوراً ہمارے شانے کا سہارا لیا) آپ جانیئے کہ اگر آپ مس بندوق والا کی جگہ ہوتے تو آپ کے کیا احساسات ہوتے۔ انہوں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "مسٹر"، عفو بھائی نے اضافہ کیا "عفو"۔ انہوں نے کہا "مسٹر عفو! مجھے بہت افسوس ہے میری وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف کرنا پڑی نوٹس تو بعد میں بھی آ سکتے تھے آپ کو اپنی صحت کا خیال کرنا چاہیئے" اس کے جواب میں عفو بھائی نے مخصوص "افسانہ ٹائپ" ڈائلاگ بولے "یعنی زندگی کیا ہے پانی کا بلبلہ ہے مہکتا ہوا پھول ہے کسی وقت مرجھا جائے لیکن وعدہ پھر وعدہ ہے جو ہر صورت میں پورا کرنا چاہیئے اور آپ کے لیئے تو میں بستر مرگ سے بھی اٹھ کر آ جاتا وغیرہ وغیرہ" اس پر وہ وہاں سے چلدیں جیسے ہی نظروں سے اوجھل ہوئیں عفو بھائی کی تمام کمزوری عنقا ہو گئی اور وہ ہم سے بے اختیار لپٹ گئے۔

دوسرے دن سنجیدہ نے جو رپورٹ دی وہ کافی حوصلہ افزا تھی سنجیدہ نے بتایا کہ مس بندوق والا جو کل تک عفو بھائی کو نالائق بےہودہ اور جانے کیا کیا سمجھتی تھیں ان سے کل کی ملاقات سے اگرچہ امپریس تو نہیں البتہ پہلے سے وہ خیالات بھی نہیں رہے۔

عفو بھائی اور مس بندوق والا کے تعلقات روز بروز نیم کی درخت کی طرح بڑھ رہے تھے ایک آدھ دفعہ انہیں تنہائی میں "کسی سنسان جگہ پر نہیں" باتیں کرتے بھی پایا گیا۔ آرٹس کونسل میں تصاویر کی نمائش دیکھتے ہوئے ہمارے خصوصی نمائندے نے دونوں کو دیکھا (یہ نہیں پتہ چل سکا کہ وہ اکٹھے گئے تھے یا وہاں اچانک ملاقات ہو گئی۔ ماجد کی دعا تھی کہ اللہ کرے وہ الگ الگ گئے ہوں اور وہاں ملاقات محض ایک اتفاق ہو)۔

کیمپس میں اکثر ان گناہگار آنکھوں نے ان کو ایک دوسرے کو سلام کرتے دیکھا اسی اثنا میں عفو بھائی نے ہمیں اور ماجد کو لفٹ کرانے کے سلسلے میں بخل سے کام لینا شروع کر دیا۔

چپ سادھ لی۔ سلام بھی کرنا چھوڑ دیا آسمان کو جو رنگ بدلتے دیکھا تو سنجیدہ ماجد اور ہمارا ایک ہنگامی اجلاس ہوا عفو بھائی اور مس بندوق والا کے بڑھتے ہوئے تعلقات پر اظہار افسوس کے لئے پہلے ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی پھر کافی غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ اب وقت آگیا ہے کہ مِسّ بندوق والا میں ایک رقیب (رو سیاہ نہیں) کا اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے ہم نے یہ تجویز پیش کی کہ ماجد بذاتِ خود عفو بھائی جیسے عظیم عاشق کا رقیب بننے کی سعادت حاصل کرے لیکن ہماری اس ناچیز رائے کو واضح اکثریت سے رد کر دیا گیا اور معاملہ غیبی امداد پر چھوڑا۔ آسمان کی طرف ہاتھ بلند کئے آنکھیں میچ کر دل کی گہرائیوں سے اللہ میاں سے دعا مانگی کہ جلد از جلد ایک ڈھیٹ سا رقیب عفو بھائی کو نصیب فرمائے سب نے سچے دل سے آمین کہا (ماجد نے زیرِ لب ثم آمین کہی)۔

ایک ہفتہ گزر گیا ہماری طرف سے پروگریس بالکل نل تھی ڈیپارٹمنٹ کی لائبریری شام چھ بجے بند ہوتی۔ عفو بھائی نے پڑھائی میں حیرت انگیز دلچسپی لینا شروع کر دی تھی شام ساڑھے پانچ بجے لائبریری جاتے اور چھ بجے سب سے آخر میں لائبریرین کا ہاتھ تھامے تھکے تھکے قدموں سے باہر آتے۔

عفو بھائی آخر کو ہمارے کزن تھے اگرچہ وہ ہمیں لفٹ کرانے کے موڈ میں نہ تھے لیکن پھر بھی ہم ایک دن ان کے گھر جا دھمکے دروازہ کھٹکھٹانے پر ان کے منے سے بھائی تشریف لائے انہیں اپنا نام بتایا اندر گئے واپس آکر کہا کہ بھیا کہہ رہے ہیں کہ ہم گھر پر نہیں ہیں۔ ہمیں یہ سن کر بہت کوفت ہوئی دعا مانگی یا اللہ عفو بھائی پر وہ وقت لا کہ وہ ہمارے در پر آئیں اور ہم خود باہر آکر انہیں اطلاع دیں کہ ہم گھر پر تشریف نہیں رکھتے۔

کلاسیں شروع ہوئے تقریباً دو ماہ ہو چکے تھے داخلے ابھی تک جاری تھے ایک محترم نے بھی نیا داخلہ لیا پنجاب کی کسی سابقہ ریاست کے نواب کے بھتیجے وغیرہ تھے نام تھا پرنس دلبر خان۔ پہلے ہی دن اپنی لمبی سی امپالا میں یونیورسٹی آئے اور دوسرے دن انہوں نے باہتمام یہ ثابت کر دیا کہ یہی وہ حضرت تھے کہ جن کا ہمیں انتظار رہتا۔ پرنس دلبر جان خاصے سمارٹ واقع ہوئے تھے۔ اس پر نواب خاندان سے تعلق تھا۔ نہایت آزاد ماحول کے پروردہ دکھائی دیتے تھے انہوں نے ایک دو دن حالات کا جائزہ لیا (اس اثناء میں ہمیں ماجد یا عفو بھائی کو قطعی درخورِ اعتنا نہ سمجھا) اس کے بعد یکدم یلغار کی اور انہوں نے اس کام کی بسم اللہ کی کہ ماجد کا جی چاہا کہ ان سے لپٹ کر ان کے روئے مبارک کو چوم لے۔ پرنس دلبر جان نے تیسرے دن سے ہی ہاتھ پیر پھیلانا شروع کئے اور سب سے پہلی واقفیت انہوں نے مس شرمیلی بندوق والا سے پیدا کی جس دن پرنس نے پہلی دفعہ محترمہ سے گفتگو کی تو شاید عفو بھائی نے زیادہ توجہ نہ دی لیکن اس کے بعد جو ہر روز ان کی بات چیت کا سلسلہ نکلا ہے تو ہمیں بھی عفو بھائی کے چہرے پر ناگواری اور فکر مندی کی لکیریں ابھرتی دکھائی دیں۔

اسی اثنا میں نوٹس بورڈ پر یہ اطلاع آویزاں کی گئی کہ اگلے ہفتے شعبے کے طلباء کا تقریری مقابلہ ہوگا۔ مقابلے میں حصہ لینے والوں میں پرنس دلبر جان اور عفو بھائی پیش پیش تھے۔

پچھلی دفعہ جب عفو بھائی کے در سے دھتکارے گئے تھے تو جی میں قسم کھائی تھی کہ آئندہ اس گلی کا رخ نہ کریں گے لیکن آخر اپنا خون تھا لہٰذا دل پر جبر کرتے ہوئے ہم نے ان کے گھر کی راہ لی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ان کے چھوٹے بھیا تشریف لائے اس دفعہ انہوں نے نام پوچھے بغیر کہا "بھیا کسی سے مل نہیں سکتے ہم نے پوچھا کیوں منے! کیا شغل فرما رہے ہیں جو ایسی مصروفیت ہے؟" منے میاں نے کہا "کہ پرسوں جب یونیورسٹی سے واپس آئے تو رات کو ابا جان سے کچھ لکھوایا اور اس کے بعد سے روزانہ یونیورسٹی سے آکر شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر عجیب عجیب چہرے بناتے ہیں آج صبح تمام ہمسایاں امی سے ملنے آئیں اور بھیا کے بارے میں پوچھ رہی تھیں ان میں سے ایک نے یہ بھی کہا کہ اللہ خیر کرے اس جوانی کے عالم میں یہ حالت۔ پھر منے میاں نے ہم سے پوچھا "آپ بتائیے بھیا کو کیا ہو رہا ہے آج کل ہم نے پیار سے کہا منے آپ کے بھیا کو آج کل "بندوق والا" ہو گیا ہے" بے چارہ ہماری طرف حیرت سے تکنے لگا۔

خیر صاحب ڈیبیٹ کا دن بھی آ ہی گیا۔ مباحثے کا موضوع تھا۔ "کیا گندم زیادہ اہم ہے محبت سے" ماجد نے مع کچھ خلیفہ حضرات کے عفو بھائی کو ہوٹ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ بہر حال مباحثہ شروع ہوا۔ چند خواتین و حضرات نے موافقت اور مخالفت میں اپنے اپنے دلائل پیش کئے۔ اللہ اللہ کر کے عفو بھائی کا نام بھی پکارا گیا۔ معلوم ہوا کہ موافقت میں بولیں گے۔ ہمیں یہ سن کر بہت حیرت ہوئی۔ ہمارا ذاتی خیال تھا کہ عفو بھائی مخالفت یا موافقت کے چکروں میں ہرگز نہ پھنسیں گے۔ بلکہ منافقت میں بولیں گے۔ جیسے

ہی عفو بھائی کا نام پکارا گیا۔ پورا ہال خلیفہ، خلیفہ کے نعروں سے گونجنے لگا۔ (آپ کو ہم پہلے بتا نہ سکے کہ عفو بھائی کا نام اُن کے EX کلاس فیلوز نے متفقہ رائے سے خلیفہ رکھا ہوا تھا۔) عفو بھائی نعروں سے کافی پریشان دکھائی دیتے تھے۔ لہٰذا بسم اللہ ہی غلطی سے کی کہ موافقت ہے Resistance کے بجائے گھبراہٹ میں مخالفت کی طرف کھڑے ہو گئے۔ اس سے قبل کہ وہ شروع ہوتے مباحثے کے سیکرٹری نے ان کا ہاتھ تھام کر اصل ٹھکانے پر کھڑا کیا۔ عفو بھائی نے اب اپنی تقریر شروع کرنا چاہی۔ انہوں نے منہ ہلایا۔ لیکن آواز نہ نکل سکی۔ ماجد کے گروپ سے ایک آواز ابھری "خلیفہ جی"۔

تمام ہال زعفران زار بن گیا۔

عفو بھائی سے اور کچھ نہیں ہو سکا تو زور سے Resistance پر مکا مارا اور کہا "ہندو مائیتھالوجی کہتی ہے کہ دنیا گائے کے سینگ پر قائم ہے۔ بتایئے صاحبِ صدر کہ گائے کی خوراک گندم ہے یا محبت؟ پیچھے سے آواز آئی! بھیا کہیں گائے کے حصے کی گھاس تو نہیں چر گئے؟ اگر گائے کو گندم نہ ملی تو وہ مر جائے گی اور دنیا تہہ و بالا ہو جائے گی۔ ابھی عفو بھائی کے دلائل جاری تھے کہ ماجد اینڈ گروپ میں سے کسی نے تاک کر کاغذ کی گولی عفو بھائی کے ناک پر ماری۔ عفو بھائی نے جو جھلاہٹ میں اپنے چہرے کے سامنے ہاتھ گھمایا تو وہ ایک جھٹکے سے ان کی عینک کو اڑا گیا۔ جو اچھل کر مس بندوق والا کی گود میں گری جو سب سے آگے لائن میں بیٹھی تھیں۔ اس پر قہقہوں کا جو آتش فشاں پھٹا ہے تو الامان الحفیظ ہماری حالت یہ تھی کہ ہنس ہنس کر آنکھوں میں پانی آ گیا ہر طرف سے ریمارکس بلند ہو رہے تھے۔ غضب تو اس وقت ہوا جب ایک محترم عفو بھائی کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور نہایت گڑگڑا کر درخواست کی کہ اب وہ سٹیج سے نیچے قدم رنجہ فرمائیں تو بہتر ہو گا۔ عفو بھائی کے کسی نہایت ہی جذباتی Remark نے ان کے ناقابلِ تردید دلائل کی تعریف کے طور پر ایک عدد مرغی کا گندہ انڈا زور سے ٹکا کر ان کے سر مبارک پر ایسا مارا کہ وہیں چپک گیا اور گاہے بگاہے قطروں کی صورت میں نیچے ٹپکنے لگا۔ انڈا لگنے پر عفو بھائی کے چہرے کی جھلاہٹ چیخ چیخ کر اپنی ہستی کا احساس دلانے لگی۔ ہم نے ایک نظر عفو بھائی کا عجلت سے جائزہ لیا۔ عینک کے بغیر عجیب ہونق دکھائی دے رہے تھے۔ مختلف قسم کی رنگ برنگ ہوائیاں ان کے چہرے پر اڑ رہی تھیں۔ اور سر پر گندے انڈے کا شیرازہ کسی مشہور مصور کے تجریدی آرٹ کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ ادھر مس بندوق والا پر مستقل ہنسی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ صاحب صدر اور سیکرٹری مسلسل کچھ کہہ رہے تھے۔ لیکن شور میں کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ سچ پوچھئے تو عفو بھائی کی بڑی ہمت تھی کہ وہاں کھڑے تھے۔ کوئی ہم جیسا ہوتا تو کبھی کا نو دو گیارہ ہو چکا ہوتا۔ آخر ہم سے یہ سب کچھ نہ دیکھا گیا۔ لپک کر عفو بھائی کے پاس پہنچے۔ اور ان کا ہاتھ تھام کر سٹیج سے لے چلے (عفو بھائی کا ہاتھ بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اور ایک مسلسل تھرتھراہٹ ان کے پورے وجود پر طاری تھی (بخدا اس وقت ہمیں ان پر بہت رحم آیا) جیسے ہی ہم دونوں سٹیج پر سے اترے ہال کے درمیان سے ایک نہایت پاٹ دار آواز بلند ہوئی "پارٹنر گھر جا کر ان کا منہ اونٹ مار کر صابن سے دھلا دینا"۔ اس پر ایک اور ٹھٹھا پڑا۔ اس اثنا میں ہم عفو بھائی کو کھینچ کھانچ کر ہال سے باہر لے آئے باتھ روم لے جا کر ان کا منہ دھلوایا۔ ان کو لے کر ٹک شاپ میں گئے اور ایک PEPSI پی۔ جب ان کے دم میں دم آیا تو کہا کہ آیئے واپس چلیں۔ اس پر انہوں نے ایسی نظروں سے ہمیں دیکھا کہ ہم انہیں وہیں چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ دیکھا تو پرنس دلبر جان فنِ تقریر کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ پرنس مخالفت میں بول رہے تھے (اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ عفو بھائی نے موافقت کو کیوں چنا؟)

تمام لڑکیوں کے منہ سے "ہائے اللہ" بار بار نکل رہا تھا۔ تقریر میں تو دونوں ہی مار گئے۔ لیکن ہمیں یہ اطمینان تھا کہ رقابت کی چیمپئن شپ کافی دلچسپی کا باعث ہو گی۔

مباحثہ کے بعد عفو بھائی دو دن کیمپس تشریف نہ لائے اس دوران میں مس بندوق والا نے ہمیں ان کی بانکی سی عینک لا دی کہ انہیں لوٹا دیں۔ بے چاری عینک کے ایک شیشے کا جگر پاش پاش

ہو چکا تھا۔ ایک کمانی بھی (تیمور رنگ) بن چکی تھی۔ خیال تھا۔ کہ جب وہ آئیں تو ان سے ٹریٹ لے کر ان کی عینک واپس کر دی جائے۔ لیکن جس دن عفو بھائی نازل ہوئے تو ان کی آنکھوں پر ایک نئی عینک براجمان تھی۔ ہم نے جب انہیں ان کی پرانی عینک لوٹائی تو یہ آئیڈیا انہیں کچھ زیادہ پسند نہیں آیا۔ کہنے لگے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ جب قدرت نے میری عینک کو شرمیلی کی گود میں ڈال دیا ہے تو میں کیوں ناشکرہ بن کر واپس مانگوں اور دوسرے میں نے سوچا۔ چلو اچھا ہے اس کے پاس ہماری نشانی تو رہے گی۔ اب واپس کر ہی دیا ہے تو خیر!

عفو بھائی پچھلے ایک ماہ سے کافی پریشان اور فکرمند دکھائی دے رہے تھے اور ہوتے کیوں نہ۔ مس بندوق سے ان کی جو گاہے بگاہے گفتگو یا ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ بھی آہستہ آہستہ قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ اور اس پر افتاد یہ کہ پرنس دلبر جان ضرورت سے زیادہ ہی سمارٹ ثابت ہو رہے تھے اور کلاس یا لنچ شاپ میں مس بندوق والا کے ساتھ ساتھ نظر آتے۔ قیمتی سمگل شدہ سگریٹ کا کش بھرتے اور ان کے دمکتے چاند سے چہرے کو دھوئیں کے بادلوں میں چھپانے کی سعی کرتے کہ کسی اور کی نظر نہ لگ جائے۔

عفو بھائی نے اپنے تئیں ایک دو دفعہ مس شرمیلی سے بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جواب ہمیشہ نہایت دل شکن ملا۔ شاید ہمیں ان کوششوں کی بابت معلوم نہ ہوتا۔ لیکن خدا بھلا کرے سنجیدہ کا وہ مس شرمیلی بندوق والا سے تمام اطلاعات سنتیں اور ہمیں اور ماجد کو بتا دیتیں۔ انہوں نے بتایا کہ مس بندوق والا کو عفو بھائی سے سخت الجھن ہے۔ اور نہیں چاہتیں کہ وہ وقت بے وقت ان سے آ کر چمٹیں۔

جب سے عفو بھائی کے تعلقات مس بندوق والا سے خراب ہونے شروع ہوئے تھے۔ ہماری اور عفو بھائی کی دوستی میں اُسی وقت بہار نے اپنے رنگ بھرنے شروع کر دیئے۔ زیادہ تر وقت مس بندوق والا کے بارے میں باتیں کرتے گزرتا۔ عموماً ایسی باتوں پر میر حاصل بحث ہوتی کہ پرنس دلبر جان کو کسی طرح مکھن میں سے بال کی طرح اس پورے قصے میں سے نکال دیا جائے ان کا خیال تھا کہ کسی ویرانے میں جا کر ان کی ذرا سینکائی کر دی جائے۔ جب کہ ہمارا اصرار تھا۔ کہ عشق کے بھی اپنے سے ETHICS ہوتے ہیں اور رقیب کی پٹائی کرنا ان کے خلاف ہے۔ لیکن اس سلسلے میں عفو بھائی کی معلومات ہم سے کہیں زیادہ وسیع تھیں۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں رقیبوں کی قسمت کا فیصلہ DUEL لڑ کر ہوتا تھا۔ لہٰذا کیوں نہ اس روایت کو زندہ کیا جائے۔ عفو بھائی آخری لیسلی کے انسان تھے۔ جبکہ پرنس اچھی خاصی ڈبل ڈول والے تھے۔ اور ہمارا خیال تھا اگر ہتھیار کے طور پر پھولوں کی چھڑی بھی استعمال کی گئی تو پرنس عفو بھائی کی وہ دھنائی لگائیں گے کہ مرتے وقت اپنی اولاد کو بھی شغلِ عشق سے توبہ کی وصیت کرنے جائیں گے۔

[redacted]

دلبر کی کار میں

بیٹھے ہوں تو مجال ہے

کہ معمولی سا بھی جھٹکا لگے

[redacted]

ایک دن کلاس میں ہم اور عفو بھائی عین مس بندوق والا کے پیچھے والی بنچ پر بیٹھے تھے۔ پروفیسر صاحب کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ پرنس دلبر سب سے پچھلی بنچ پر جلوہ افروز تھے۔ شاید اس لئے کہ عدم نے کہا ہے ؎

اظہارِ محبت کرنے کے آداب کچھ ایسے سہل نہیں
افراطِ نمائش سے اکثر دلدار خفا ہو جاتا ہے

عفو بھائی کے کان مس بندوق والا اور ان کی ساتھی خواتین کی باتوں میں اٹکے ہوئے تھے۔ وہ لوگ ادھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھیں۔ باتوں ہی باتوں میں کہیں سے لاہور کی شکستہ سڑکوں کا ذکر آ نکلا۔ اس پر مس بندوق والا نے اپنی ساتھی سے کہا "بھئی سڑک کیسی بھی شکستہ ہو۔ دلبر کی کار میں بیٹھے ہوں تو مجال ہے کہ کہیں معمولی سا جھٹکا بھی لگے۔" یہ سن کر عفو بھائی کو ایک شدید جھٹکا لگا۔

"ابھی کل ہی کی بات ہے ہم دلبر کے ساتھ شالامار باغ دیکھنے گئے تھے۔ سنا تھا کہ رستے میں سڑکیں بری طرح ٹوٹی ہوئی ہیں۔ پر بھئی ہمیں تو کہیں بھی احساس نہیں ہوا۔ اتنی آرام دہ کار ہے کہ کیا بتائیں۔ تنا عسمےلا لمہ" انہوں نے بے اختیار پرنس کی امپالا کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ "ہاں! البتہ ان کی چھوٹی گاڑی میں ذرا معلوم ہوتا ہے کہ کار ٹوٹی ہوئی سڑک پر سے گزر رہی ہے۔" اس پہ ساتھ والی محترمہ نے استفسار کیا۔ "اچھا ان کے پاس دوسری گاڑی بھی ہے۔ ہم نے تو کبھی نہیں دیکھی۔ وہ کبھی یونیورسٹی لائے بھی تو نہیں۔" مس بندوق والا نے جلدی سے کہا۔ "ہاں! یہاں تو نہیں لائے ایک دفعہ شام کو ان کے گھر گئی تھی اور شام کی چائے ان کی ممی ڈیڈی کے ساتھ پی تھی۔ بہت سویٹ لوگ ہیں۔ چائے کے بعد ہم سب نے ان کی چھوٹی گاڑی میں ٹھنڈی سڑک کی سیر کی تھی اور پتہ ہے دلبر کا کمرہ اتنا خوبصورت اور دلکش ہے اتنا پیارا سا ۲۰۷ - دبیز قالین، ریڈیو گرام اور ......" ابھی اُن کی بات جاری ہی تھی کہ عفو بھائی ایک دم اٹھے اور پلک جھپکتے ہی کلاس سے غائب ہو گئے اس پر ہم بھی لپک کر باہر پہنچے۔ دیکھا تو عفو بھائی تیز تیز قدم اٹھاتے لان کی طرف جا رہے ہیں ہم نے جلدی سے انہیں جا لیا۔ پسینے کے ننھے قطرے ان کے ماتھے پر دمک رہے تھے اور رنگ اڑا اڑا سا تھا۔ ہمیں دیکھا تو کہا۔ "کزن جو کچھ تنزیلی نے کہا تم نے سنا۔" اس پر ہم نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔ عفو بھائی نے ہمارا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا "تم کیا کہتے ہو کیا یہ سب سچ ہے؟" اس پر ہم نے آہستہ سے ان کو تھپتھپایا اور انہیں لے کر ٹک شاپ کی طرف چلے۔

ماجد ان حالات کی تبدیلی پر کافی مسرور دکھائی دیتا تھا۔ سنجیدہ کی اطلاعات کے مطابق پرنس اور تنزیلی اب اکثر سینما دیکھنے بھی اکٹھے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھار شام کو راوی میں کشتی پر سیر بھی کی جاتی ہے۔

انہیں دنوں ہماری کلاس پکنک منانے جہانگیر کے مقبرے پر گئی۔ کافی دلفریب مقام ہے۔ راوی وہاں سے بمشکل دو سو قدم ہے لاہور کے سینے پر خراماں خراماں رواں ہے۔ ہم ماجد عفو بھائی، پرنس دلبر مس بندوق والا بھی گئے۔ پرنس اور بندوق والا ساتھ ساتھ رہے۔ دونوں کا پکنگ بیگ بھی مشترکہ تھا۔ اُدھر عفو بھائی ہمارے ساتھ تھے۔ کافی شغل رہا۔ ماجد کی تجویز پر ایک کھیل شروع کیا گیا۔ بہت ساری پرچیوں پر مختلف چیزیں لکھ دی گئیں۔ ہر دفعہ ایک شخص پرچی اٹھاتا۔ جو سوال اس پہ درج ہوتا اس کا جواب دیتا۔ ایک صاحب کو سوال آیا "آپ کو کون سی خاتون سب سے زیادہ پسند ہیں" تھوڑی سوچ بچار کے بعد ۲۰۷ کی ایک خوبصورت آرٹسٹ کا نام لیا۔ اس پر کافی ہنسی کا سامان ہوا۔ عفو بھائی کو حکم ملا۔ کہ کان پکڑ کر تین دفعہ مرغے کی آواز نکالیں۔ انہوں نے وہ آواز نکالی جو مُرغا اس وقت نکالتا ہے جب اُسے احساس ہو کہ کوئی تیز دھار چھری اس کے گلے پر پھر رہی ہے۔ خواتین میں پہلی پرچی مس بندوق والا نے اٹھائی۔ انہیں جو سوال ملا تھا اس سے ایک منٹ کے لئے ماحول پر سکوت طاری ہو گیا۔ سوال تھا "آپ کو کلاس میں سب سے زیادہ کون شخص پسند ہے؟" ہم نے جھٹ عفو بھائی کی طرف دیکھا۔ ان کا ادھر کا سانس اُدھر اور نیچے کا نیچے پھنسا ہوا تھا۔ مس بندوق والا نے سوال پڑھ کر سر جھکا دیا۔ اس پر ہر طرف سے اصرار ہوا کہ جواب ضرور دیا جائے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا "پرنس دلبر جان" یہ سننا تھا کہ ہمیں محسوس ہوا۔ آسمان سے ناگہاں ایک بجلی گری جو عفو بھائی کے ہرے بھرے چمن زار کو خاکستر کر گئی۔ سب نے اس جواب کو ایک ممکن جواب سمجھتے ہوئے سنا اور کھیل آگے بڑھتا گیا۔ البتہ عفو بھائی وہاں سے

اٹھ کر کہیں چلے گئے۔ پکنک کے تیسرے یا چوتھے روز عفو بھائی نے ہم سے کہا کہ ان کی والدہ ہم سے ملنا چاہتی ہیں۔ ہمیں خاصی حیرانی ہوئی۔ لیکن معاملہ ضرور کوئی اہم تھا۔ لہٰذا ہم یونیورسٹی سے سیدھے ان کے گھر پہنچے۔ سلام کرنے پر ان کی امی نے ڈھیروں دعائیں دیں۔ عفو بھائی ذرا کمرے سے ادھر اُدھر ہوئے تو وہ فرمانے لگیں۔ بیٹا یہ عفو کو نہ جانے کیا ہوگیا ہے۔ کوئی ایک ہفتے سے مسلسل مجھے اور اپنے والد سے اصرار کر رہا ہے کہ اسے کوئی پرانی کار خرید دیں۔ جب انہیں سمجھایا کہ اتنی متوسط تنخواہ میں ان کے لئے کار نہیں خریدی جاسکتی تو صاحبزادے غصے میں آگئے اور کار کی اہمیت پر والد صاحب کو نہایت ڈھٹائی سے ایک لیکچر سنا دیا۔ کہنے لگے۔ فی زمانہ عزت کا معیار اچھی پوشاک اور عمدہ کار ہے۔ اچھے کردار اور شعور کی بلندی کو کوئی نہیں دیکھتا۔ جب ان سے کہا گیا کہ تمہارا کہنا سب صحیح۔

وہ شوخ شوخ نظر سانولی سی ایک لڑکی
جو روز میری گلی سے گذر جاتی ہے
سنا ہے وہ کسی لڑکے سے پیار کرتی ہے
بہار ہو کے تلاش بہار کرتی ہے

لیکن بتاؤ کار خریدنے کے لئے پیسے کہاں سے آئیں تو فوراً جواب دیا کہ مکان بیچ دیں ان کی امی نے نہایت پُر درد آواز میں کہا۔ بیٹا گھر کا سکون درہم برہم ہو چکا ہے باپ بیٹے کی بول چال بند ہے۔ عفو کہتا ہے گھر چھوڑ دوں گا۔ اچھا بھلا تھا نجانے کیوں کار کا سودا جی میں سما گیا۔ پچھلے چار سال میں ایک دفعہ پاس ہو کر نہیں دیکھایا۔ اور اب ضعیف باپ کو اور پریشان کر رہا ہے۔" ہم نے ان کی والدہ کو اپنے طور پر تسلی دی کہ ہم انہیں سمجھا دیں گے اور پھر عفو بھائی کے حق میں دعائیں مانگتے واپس لوٹے۔

دوسرے دن ہمیں سنجیدہ خانم نے بتایا کہ اسی اثناء میں عفو بھائی نے ایک دن موقعہ پا کر مس بندوق والا کو اخلاقیات کے بارے میں کچھ ڈائیلاگ سنائے۔ مثلاً پرنس دلبر جیسے لوگ عیاش ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں۔ عورت کو کھلونا سمجھتے ہیں اور کہیں مس بندوق والا بھی دھوکہ نہ کھا جائیں۔ اس پر مس بندوق والا نے انہیں خوب کھری کھری سنائیں کہ وہ اپنا بُرا بھلا ان سے بہتر سمجھتی ہیں۔ بالغ نظر ہیں۔ جو کریں گی اپنی بہتری کو مدِ نظر رکھیں گی۔ اور یہ کہ وہ اپنے کام سے کام رکھا کریں۔ اور زیادہ سمارٹ بننے کی کوشش نہ کریں۔

اس بات کا ذکر ہم نے عفو بھائی سے کیا تو پہلے صاف مکر گئے ہم نے اصرار کیا تو پوچھا کہ کس نے بتایا۔ ظاہر ہے ہم بھانڈا پھوڑنے سے تو رہے۔ ہم نے نے کہا۔ ہم نے تو اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔ بہرحال کہنے لگے کہ میں نہیں چاہتا کہ مس بندوق والا جیسی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کے ساتھ زیادتی ہو۔ اور اگر ایسا ہوا تو یہ تمام انسانیت کی توہین ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ اُن کی لن ترانی جاری تھی کہ ہم نے عرض کی کہ حضرت اب بس کیجئے۔ آپ کا مطلب واضح ہوگیا ہے۔

عفو بھائی نے اچانک ایک نئی کروٹ لی۔ یکایک وہ سرمایہ داری کے خلاف ہو گئے۔ اٹھتے بیٹھتے وہ پیسہ۔ سرمایہ اور سرمایہ داروں کو گالیاں دیتے۔ (وجہ آپ سمجھ گئے ہوں گے) اس سلسلے میں اکثر و بیشتر پرنس کے بارے میں رائے زنی فرماتے۔ پوری کلاس میں انہوں نے تبلیغ کی کہ پرنس کے والد بزرگ وار نہایت اعلیٰ معیار کے سمگلر ہیں اور یہ کہ ان کے ہاں حرام کا مال بہت آتا ہے۔ لیکن صاحب ان باتوں سے کچھ نہ بننا تھا نہ بنا۔

عفو بھائی اب ہم سے مس بندوق والا کا ذکر بہت کم کیا

منکہ ایک افسانہ نگار

مرزا محمد مجاہد

سیکرٹری جنرل "حلقۂ ادب"

نشتر میڈیکل کالج ملتان

میں نے اپنے معصوم بچپن کو خیرباد کہا اور دنیائے عمر میں ایک عدو چھلانگ لگانے کے بعد یک لخت زمین بلوغت پر دھڑام سے آن پڑا۔ اب میرے گرد پھول بھی تھے، کانٹے بھی، روشن راہیں بھی تاریک سائے بھی، انسان بھی گدھے بھی اور ان سب کے متعلق حصولِ معلومات کے لئے کتب رنگارنگ کے انبار گراں بار بھی میرے چاروں طرف لائبریریوں، دکانوں، الماریوں اور خوبصورت بک ریکس میں گرد آلود کپڑوں میں بندھے ہوئے بکھرے پڑے تھے کیونکہ میں شکم مادر ہی سے عقل سلیم کا گنج بے بہا اپنے سر کے خول میں مقفل کر کے لایا تھا اس لئے میں نے ہر چیز سے نپٹنے کے لئے حد درجہ عقلمندی برتی۔ پھول کو اس لئے نہیں چھوا کہ کانٹا چبھ جائے گا، روشن راہوں پر اس لئے گامزن نہ ہوا کہ میرا سایہ از خود تاریک بنتا تھا۔ انسان اور گدھے کو سمجھنے کی لاحاصل کوشش اس لئے نہیں کی کہ مجھے خود پوری طرح سجھائی نہ دیتا تھا کہ کون گدھا ہے اور کون انسان۔ (بائی دی وے آپ کو یہ سب کچھ ہضم ہو رہا ہے) آپ یہ نہ سمجھئے کہ میں بے وقوف تھا بات دراصل یہ تھی کہ مابدولت کی آنکھوں تلے اندھیرا سا چھانے لگا تھا اور کسی نے بتایا کہ کسی حیاتین کی کمی کے باعث یہ نقص ہے۔ چنانچہ خیراتی ہسپتال میں جا جا کر ایک ڈاکٹر صاحب کو دکھایا جن کی آنکھیں بہت تیز تھیں اور وہ بہت گھور گھور کر اور کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ پھر وہ مجھے ایک کمرے میں

لے گئے اور آنکھوں پر دو حلقے سے چڑھا کر ان میں سے ٹھکا ٹھک شیشے فٹ کرنے شروع کئے اور سامنے والے چارٹ پڑھنے کو کہا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ یہ سارا ڈرامہ محض ڈاکٹر صاحب کی تفریح طبع کے لئے کھیلا جا رہا ہے۔ آخر اس سازش کے تحت ہم دو چشم سے چہار چشم ہو گئے۔

جب میں عینک لگا کر بڑے طنطنے سے اسکول پہنچا تو کچھ دوستوں نے چھوٹتے ہی کہا۔ "میاں آج تو جینئس نظر پڑتے ہو۔"

تو صاحب یہ چند الفاظ تھے جنہوں نے میری کایا پلٹ کر رکھ دی میرے ذہن میں انقلاب برپا کر دیا۔ اب میں روزانہ "لائبریری" جاتا اور ابن صفی کے ہلچل، ٹھاہ، ٹھاہ، ہش، ٹھیں ٹھیں، دھڑام، پٹاخ، چٹاخ، جاسوسی، قتل، قتل قتل، سراغ، ہینڈز اپ، ڈزن، ڈزن والے ناول لے آتا اور پڑھتا۔ کالج تک پہنچتے پہنچتے میں نے جاسوسی ناولوں کا ایک ذخیرہ پڑھ ڈالا۔

پھر اچانک میرا معیار بلند ہو گیا تھا اس لئے میں نے کالج لائبریری سے آہ، واہ۔ آخاہ، چیخ پکار، ہائے، اُف۔ ہاہ، آہیں، ٹپ ٹپ، آنسو، مگرمچھ، بے وفائی، وفا، عشق، مشک، کھانسی، نزلہ، زکام، اسپرو، الفت، محبت، دلہن، شاخ، الو، گلستان والے ناول پڑھنے شروع کر دیئے۔

اس کے بعد ہمارا مزاج کسی درخت کی اونچی سی چوٹی پر چلا گیا۔ (ڈائیلاگ ہے)۔ اور ہم نے جام، صبو، دوری، نزدیکی، میخانہ، پاگل خانہ، واہ واہ، داد، وغیرہ پڑھنی شروع کر دیں اور دیوان کے دیوان چاٹ لئے۔

اب چند ماہ ہوئے کہ مجھے ایک نرالی بیماری نے آلیا ہے جس کا نام شاید "Fictious syndromo" ہے اور صاحب اس کی علامات میں سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ مجھ پر افسانہ نگاری کا جنون سوار ہے۔ اب ہر وقت اچھوتے پلاٹ سوچنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن جب غسل خانے میں نہاتے نہاتے "پالیا" کہہ کر ارشمیدس کی طرح ننگا دوڑ لگانے کے لئے پر تولتا ہوں تو ذہن کسی چلتے ہوئے انجن کی طرح اچانک خاموش ہو جاتا ہے اور پھر میں سوچتا ہوں کہ یہی چیز تو میں نے آج سے چند ماہ پیشتر کرشن چندر کے افسانے میں پڑھی تھی۔

پہلے میں نے فیصلہ کیا کہ اگر افسانہ نگار بن کر شہرت دوام حاصل کرنی ہے تو احمد ندیم قاسمی کی طرح انقلابی افسانے کیوں نہ لکھے جائیں چنانچہ کاغذ سنبھالا اور اپنے قلم کو ٹڑی سوچ بچار کے بعد صفحہ قرطاس پر رواں دواں کیا۔

"یہ دنیا کیسی دنیا ہے۔ جہاں غریب، غریب تر اور امیر، امیر تر ہوتا جا رہا ہے، غریب کا کوئی والی نہیں۔ اس کا کوئی وارث نہیں نہیں نہیں، نہیں، نہیں ...... آگے کیا لکھوں۔ پلاٹ، الفاظ، انقلابی خون، مزدور، بیوہ، مستقل مزاج کنوار، سسکی عورت، انقلاب

یہ منظر دیکھ کر
مولوی سلیم اللہ
نے مسجد کی راہ لی
اور نگہت وضو
کرنے لگی

انقلاب، انقلاب۔ غریب، غریب، غریب، ۔نہیں، نہیں، مشکل ہے۔ یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ غریب کو معاشرے میں میں کبھی اونچا مقام نہیں دلا سکتا۔ میں کبھی بھی عوام کی پکار بن کر الفاظ کی صورت میں نہیں ڈھل سکتا۔ میں معاشرتی ناانصافی کی لعنت کبھی دور نہیں کر سکتا۔ جب میں کچھ نہیں کر سکتا تو میں انقلابی افسانہ نگار کیوں بنوں۔ اگر بن بھی جاؤں تو لوگوں کی تنقید کا ہدف بنوں گا لوگ مجھے اشتراکی کہیں گے، سرخا کہیں گے، چنانچہ اب .....

درحقیقت مجھ میں رومان کچھ زیادہ ہی ہے۔ کسی حسین چہرے کو دیکھ لوں تو دیکھتا رہ جاتا ہوں (کیونکہ مجھے NYSTAGMUS ہے جس میں اگر آنکھ ایک طرف کو تیزی سے جائے تو دوسری طرف بہت آہستہ آتی ہے) میں کبھی کوئی رومانی افسانہ پڑھوں تو میری آنکھوں میں جھڑیاں لگ جاتی ہے۔ ہیرو کی ناکامی پر نہیں بلکہ اپنی بزدلی کی وجہ سے کیونکہ میں کسی پر ڈھائے گئے ظلم پڑھنا تک برداشت نہیں کر سکتا۔

ناول میں کہیں رومانی اشعار لکھے ہوں یا ہیرو و ہیروئن ایک دوسرے سے پیار بھرے مکالمے بول رہے ہوں تو دل کی دھڑکن بہت تیز ہو جاتی ہے دراصل میں مجھے "Tacchrcardio" کا عارضہ بھی ہے، اور جہاں کہیں دو دلوں کا وصال دکھایا گیا ہو وہاں میں بھی آنکھیں بند کر کے تصورات کی حسین دنیا میں کھو جاتا ہوں (کیونکہ میرا "sleeping centre" بہت تیز ہے اور خواب بھی حسین تصوراتی ہوتے ہیں۔

میں نے اپنے آپ میں افراطِ رومان کو ملحوظ رکھتے ہوئے رضیہ بٹ کی ماحول نگاری اور منظر کشی والا انداز اپنانے کی ٹھانی، پس بندہ نواز اب ایک بار پھر قلم کو محو جنبش ہونے کی تکلیف سے دوچار کیا۔ بے چارہ کسی سجیلے بانکے کی طرح بڑے "Romantic" انداز میں خراماں خراماں گلشن صفحات کے ایک تختے پر چہل قدمی کرنے لگا۔

" عمران پارک میں بہار کا دور دورہ تھا۔ حسینہ بہار پورے بناؤ سنگھار کے ساتھ محو خرام تھی۔ رنگا رنگ کے پھولوں کی خوشبو۔ سبزے کی تراوت، بیلوں سے بنائی گئی محرابیں، جابجا گھاس کے ہرے بھرے تختے اور پھر مختلف طائران خوش الحان کی نغمہ سرائیاں فردوس گوش اور جنت نگاہ ثابت ہو رہی تھیں... ایک پھول کے قریب ایک بلبل بیٹھا نغمہ سرائی میں مگن تھا کہ دور سے ایک بھونرا اڑتا ہوا آیا اور بلبل کے گرد منڈلانے لگا۔ بلبل بیچارہ بھونرے کی گھن گرج سن کر اڑنے پر مجبور ہو گیا، اور پھر بھونرے نے رس چوسا اور جاکر گائے کے گوبر پر بیٹھ گیا۔ . . . نگہت کے زانو پر سر دھر کر لیٹے ہوئے سلیم صاحب یہ تمام منظر بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا . . . . ."

باپ رے باپ۔ یہ کیا لکھ گیا۔ زانو پر سر" اگر امی جان کی نظر سے یہ الفاظ گذر گئے تو وہ کیا کہیں گے کہ کتنی عریاں باتیں لکھتا ہے میرا بیٹا جس کی شرافت کے گن گاتے گاتے میری زبان نہیں تھکتی۔ فوراً تبدیلی کی۔ "یہ منظر دیکھ کر مولوی سلیم صاحب نے مسجد کی راہ لی اور نگہت وضو کرنے لگی۔" دل بھائی کو میری یہ روش افسانہ نگاری بھی نہ بھائی۔

دہ مارا۔ امی جان عورتوں کے لکھے ہوئے ناول بڑے شوق سے پڑھتی ہیں تو کیوں نہ اے آر خاتون کا انداز اپنایا جائے۔ اور اس انداز میں معاشرت کی عکاسی بھی تو بڑے درد انگیز پیرائے میں کی جا سکتی ہے۔ اور ہاں سونے پر سہاگہ یہ کہ معاشرے پر طنز بھی بڑے لطیف الفاظ میں کی جا سکتی ہے تو بھیا اب میری افسانہ نگاری کا تیسرا دور شروع ہوا اور ذہن رسا نے افسانے کی ابتداء کچھ یوں کی۔

" اے بوا! جب دیکھو نگوڑی ماری منہ ہی لبسورتی رہتی ہے۔ کسی کی بھی تو اسے نہیں آتی جو چار گز پیراہن کے ساتھ رخصت کر دیں۔"

بیچاری ثمینہ کو اس قسم کے فقرات تقریباً روزانہ سننے پڑتے تھے۔ لیکن اس کا تھا بھی کون جس کے برتے پر وہ احتجاج کر سکتی چنانچہ بن ماں باپ کی بچی روتے روتے ہلکان ہو جاتی اور پھر سسکیاں بھرتے بھرتے اسے نیند آ دبوچتی۔ پھر اسے خواب میں اپنے ابو امی دکھائی دیتے ہیں جو اس سے پیار بھری باتیں کرتے ہیں اور ابھی وہ باتیں کر رہے ہوتے ہیں کہ پھوپھو کا صرف ایک ہاتھ فضا میں نمودار ہوتا ہے اور زور سے ایک چانٹا اس کے نازک گالوں پر رسید کرتا ہے اور وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھتی ہے۔"

اُف خدایا! قارئین خاطر جمع رکھئے، میں نے ثمینہ کے گال پر جڑے گئے تھپڑ کی تکلیف سے اف نہیں کیا بلکہ یہ تھپڑ "ACTUALLY" ہمارے رخسار پر پڑا تھا۔ سامنے ابا جان ــــ

بڑے غصے میں تھے اور بے طرح بولے جا رہے تھے" نالائق امتحان سر پر ہے اور صاحبزادے لگے ہیں افسانہ نگاری کرنے۔ کان کھول کر سن لو کہ اگر میں نے آئندہ کبھی تمہیں ان فضولیات میں مصروف دیکھا تو گھر سے نکال دوں گا۔ آج ایک تھپڑ پہ ہی اکتفا کرو کیونکہ عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے، ویسے یہ بھی سن لو کہ افسانہ نگار اور شاعر نرے بدھو ہوتے ہیں۔ گدھے ہوتے ہیں۔ ان کے پاس سوائے باتیں بنانے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ تم بھی گدھے ہو گدھے . . . . .

واللہ میں تو اب تک تاریکی میں تھا مجھے تو گدھے کی مکمل تعریف بھی معلوم نہ تھی

تو ادیبوں کو گدھا کہا جاتا ہے، لیکن جب گدھا بننے کی ٹھانی ہے تو سختیوں کی بار برداری بھی کرنا ہوگی، مگر اب اے آر خاتون کے سے خیالات بھی فضا میں تحلیل ہو چکے تھے۔ ابا جان پر غصہ آ رہا

دل چاہ رہا تھا گھر سے نکل جاؤں ۔ مجرم بن جاؤں ۔ اپنا ہی گھر تباہ کر ڈالوں ۔ دنیا میری دہشت پسندی کے قصے سن سن کر کانپ اٹھے اور میں بڑے ٹھاٹھ سے انہیں لوگوں میں رہوں جنہیں میں لوٹتا ہوں ۔ یعنی ۔ ٹھاہ ۔ سلطان ۔ نہ ۔ "ہا" ۔ خبردار ۔ لیکن میں مجرم کیوں بنوں ؟ میں کیوں نہ دنیا کو جرائم کے ایسے ایسے لرزہ خیز قصے سناؤں کہ وہ سکتے میں آجائیں کہ کیا ایسے ایسے جرائم بھی دنیا میں جنم لے سکتے ہیں ۔

ویسے بھی سن لو
افسانہ نگار اور شاعر
بڑے بدھو ہوتے ہیں
گدھے ہوتے
ہیں

قارئین ! اگر آپ میں سے کوئی "Fictious syndrome" کا مریض ہو تو وہ بخوبی جانتا ہو گا کہ اس موذی مرض کے اثرات بڑے دور رس ہوتے ہیں ۔ انسان سوتا ہو ، جاگتا ہو ، سنتا ہو ، روتا ہو ، لیٹا ہو ، بیٹھا ہو ، چلتا ہو ، ٹھہرا ہو ، افسانے کے پلاٹ اسکے پنجرۂ دماغ میں پھڑ پھڑا رہے ہوتے ہیں اور وہ ان کو قابو میں کرنے کے لئے سوچوں کا سہارا لیتا ہے ۔ تو میں سڑک پر چلتے ہوئے سوچتا جا رہا تھا کہ میں اپنے "آئندہ مجرمانہ افسانے" کا آغاز کچھ اس طرح سے کروں گا ۔"

انسپکٹر قمر عام لباس میں سڑک پر جا رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر سوچ و بچار کے علاوہ پریشانی کے آثار بھی ہویدا تھے ۔ بات دراصل یہ تھی کہ آج کپتان حیدر نے ایک نہایت ہی خطرناک قسم کے جرائم پیشہ لوگوں کی نشان دہی کی تھی جن کا نام بین الاقوامی سطح پر جرائم کا ارتکاب کرنے کے علاوہ پولیس دشمنی بھی تھا اور انہیں جہاں کہیں بھی موقع ملتا تھا وہ پولیس سے متعلقہ افراد کو موت کی بھینٹ چڑھا دیتے تھے ۔ انسپکٹر ابھی ان سوچوں میں غلطاں ہی تھا کہ اچانک ایک تیز رفتار موٹر سائیکل اس کے بالکل قریب سے کراس کر گئی اور انہوں نے ایک طرف برق رفتاری سے چھلانگ لگا کر اپنی جان بچائی ۔"

لیکن میرے خیالات کا تانا بانا اس وقت ٹوٹا جب میرے تمام کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے اور چند لوگ مجھے بازوؤں سے پکڑ کر مین ہول سے نکال رہے تھے ۔ وہ تو بہتر ہوا کہ مین ہول کی کئی ماہ سے صفائی نہ ہوئی تھی ورنہ جان کے لالے پڑ جاتے ۔

اب میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ کسی کا بھی انداز افسانہ نویسی نہیں اپناؤں گا بلکہ اپنی ہی ایک نئی روش اختیار کروں گا ۔ میں کیوں کسی کا پیرو ہوں ۔ "نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی" جب مجھ میں افسانہ نویسی کے تمام "GUTS" موجود ہیں تو میں دوسروں کا دامن کیوں تھاموں چنانچہ میں نے اپنے دماغ کے تمام تر پیچوں کو کسا ۔ والد صاحب کے غصہ کے پیش نظر کمرے کی چٹخنی چڑھا اور صاحب ایک افسانہ تخلیق کر مارا ۔

افسانہ جیسا کیسا بھی لکھ دیا ۔ مختلف مدارج سے گزار کر اسے ایک رسالے میں اشاعت کے لئے بھیج دیا اور دوستوں میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ مابدولت کا افسانہ زیر طبع ہے ، ایک دن پندرہ دن ۔ ایک مہینہ لیکن ڈیڑھویں مہینے میری امیدوں کا استوار شدہ محل دھڑام سے زمین بوس ہو رہا ، کیونکہ افسانہ میرے ہی بھیجے گئے واپسی لفافے میں مجھے مل گیا ۔

ہمدم دیرینہ

فاطمہ شمد حسینی

سوچتا ہوں اپنا تعارف کیا کہہ کر کراؤں کوئے ستم کہوں کہ کوچہ قاتل۔ حالیہ یا سابقہ آپ سب طالب علم مجھ سے بخوبی واقف ہیں اور سال کے ایک مخصوص حصے میں میرے خواب آپ کو پریشان کرتے ہوں گے۔ سمجھ گئے جی ہاں میں آپ کا کمرہ امتحان ہوں۔

ایک طالب علم کی حیثیت سے آپ کی زندگی کے پریشان کن لمحے میرے سامنے گذرے ہیں اس طرح میں آپ کی زندگی کے اس حصے سے واقف ہوں جو سب سے زیادہ آپ کے کردار کی نمائندگی کرتا ہے کہیں میری یہ واقفیت ہی تو مجھ سے آپ کی نفرت کا سبب نہیں ہے مطمئن رہیئے یہ بھید ان کا ننگا نہیں ڈھائے گا۔

آپ جو میری چھت کے نیچے اپنی سال بھر کی محنت کا ثبوت دینے آتے ہیں مجھے تختہ دار سے کم نہیں سمجھتے لیکن یقین کیجئے میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہوتی ہیں چونکہ میں جانتا ہوں آپ کو اپنی کتابوں سے کتنی محبت ہے امتحان سے پہلے جب کتابیں رکھ دینے کا حکم مل جاتا ہے میں نے آپ کو بار بار کتابیں رکھنے کے بعد اٹھا کر پڑھتے دیکھا ہے بلکہ یہ محبت یہاں تک دیکھی ہے کہ تین گھنٹے کی مفارقت برداشت نہ کرنے کی وجہ سے آپ کس طرح اس کے چند صفحے پھاڑ کر جیب میں رکھ لیتے ہیں۔

میں نے پرچے بٹنے سے پہلے کے سنسنی خیز لمحوں کو بھی دیکھا ہے جب ہوائیاں اڑتے ہوئے شب بیداری سے پر نور چہروں کے ساتھ نانیوں دادیوں کے بتائے ہوئے وظیفے پڑھے جاتے ہیں اور بازو پر بندھے ہوئے امام ضامن یا تعویز کو ٹٹولتے ہوئے آئندہ سال بھر پڑھنے کے وعدوں کے ساتھ خدا سے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔

ان لمحوں کی سنسنی میں میں بھی شریک ہوتا ہوں اس خیال سے کہ آیا پرچے بٹنا خاموشی طاری کر دے گا یا شور حشر کی ایجاد ثابت ہوگا یہ اس لئے کہ میں

برسہا برس سے ایسے طالب علموں کو دیکھتا آرہا ہوں جنہوں نے اپنے لئے نصاب تعلیم کے تنگ و تاریک میدان کے بجائے ڈرامہ مشاعرہ الیکشن ہڑتال سینما اور گپ شپ کے پرفضا مقام منتخب کر لئے ہیں لیکن ان صحت افزا مقامات پر سال گذارنے کے بعد وہ جس اعتماد سے امتحان دینے آتے ہیں وہ سال بھر پڑھنے والوں کے لئے باعث رشک ہوتا ہے اور ہو بھی کیوں نہ جب کہ ان کا علم ذہن کی بھول بھلیوں کے بجائے آستینوں جیبوں اور جوتوں میں بوقت ضرورت باہر آجانے کے لئے موجود ہوتا ہے۔

ہم بھی آپ کے جان و مال کو دعائیں دیں گے ورنہ آپ ہمیں جانتے ہی ہوں گے.....

لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ پرچہ ان مظلوم طالب علموں کے توقعات کے خلاف آگیا اور ان کا سارا اسلحہ بے کار ہو گیا ظاہر ہی ہے ایسے موقع پر ٹوٹتی ہوئی میزوں اور چیختے ہوئے طلبا کے ہنگامے میں میری بنیادیں تک ہل جاتی ہیں عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ پرچے ملنے کے بعد وقت سے پیکار شروع ہو جاتی ہے کچھ اس جنگ میں چھ سات کاپیاں سر کر کے فاتح ثابت ہوتے ہیں باقی ہارنے کے باوجود دشمن کو برباد کر دیتے ہیں بعض یہ مقابلہ کرنے کے لئے اپنے ساتھیوں سے مدد کی درخواست کر دیتے ہیں اور اس کے جواب میں جو رحم و ہمدردی کے مظاہرے دیکھنے میں آتے ہیں وہ ساری دنیا کو یہ سبق دیتے ہیں کہ کس طرح جان پر کھیل کر بلکہ امتحان پر کھیل کر ایک دوسرے کی معاونت کرنی چاہیئے چاہے وہ نقل کا فریضہ ہی کیوں نہ ہو۔

ایسے موقعوں پر وہ لوگ جنہیں اپنے "گیس" پر بھروسہ ہوتا ہے اوروں کے دست نگر نہیں رہتے بلکہ اپنے دامن و آستین کو نئے کاموں کے لئے استعمال کر کے اپنی جدت پسندی کا ثبوت دیتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ ان موقع شناسوں کی شوخیٔ تحریر سے اکثر میری دیواریں پورے پورے سیسوں پر لکھوائے نقش فریادی بنی نظر آتی ہیں اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی طالب علم بار بار کاپی کے صفحے پلٹ رہا ہے بے چینی سے پہلو بدل رہا ہے تو اس موقع پر چپراسی کا اس کے لئے پانی لانا معجزہ نما اثر رکھتا ہے مجھے تو بارہا خیال آیا ہے کہ اگر پانی کے ذریعے افزائش علم کا یہ راز عام ہو جائے تو شاید لوگ کلائی پر گھڑی کے بجائے منہ سے گھڑے لگا کر امتحان دینے لگیں۔

لیکن یہ علم بھی سینہ بسینہ بلکہ دست بدست چلتا ہے یعنی باہر کھڑے جانثار کے ہاتھ سے امتحان دینے والے کے ہاتھ تک بذریعہ دست چپراسی کے۔

خود دار لوگ ان طریقوں کو پسند نہیں کرتے وہ تو نگراں سے دست بستہ عرض کر دیتے ہیں کہ صاحب آپ کیوں چل چل کر تھک رہے ہیں آرام سے بیٹھئے بلکہ یہاں آپ کی موجودگی ہمارے انہماک میں خلل انداز ہوتی ہے اس لئے بہتر ہے باہر تازہ ہوا کا لطف اٹھایئے۔ ہم بھی جان و مال کی دعائیں گے ورنہ آپ ہمیں جانتے ہی ہیں.....

لیکن اگر اس سب کے باوجود بھی لکھنے کو کچھ نہ ملے تو چائے منگوالی جاتی ہے اور کچھ نہیں تو جمائیاں لے لے کر وقت گذار دیا جاتا ہے یہاں تک کہ آخری پینتالیس منٹ کا اعلان ہو جاتا ہے اور قلموں کی رفتاریں تیز ہو جاتی ہیں تیس منٹ کا اعلان ہوتا ہے اب لوگ گھڑی دیکھ دیکھ کر سوال ختم کرتے ہیں اور۔ قلم رکھ دینے کا حکم مل جاتا ہے تین گھنٹے سے طاری خاموشی یک لخت کرسیاں کھسکانے کی آوازوں اور قدموں کی چاپ سے آباد ہو جاتی ہے لیکن کچھ شوقین اس وقت تک جھکے لکھتے رہتے ہیں جب تک کاپیاں ہاتھوں سے چھین نہ لی جائیں۔

آخر میں میں سال بسال واپس آنے والے وہ نوردان شوق کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں جو منزل قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں میں ان سے اگلی ملاقات کا منتظر ہوں۔

انجم سلیم طلعت

ہمیں یاد ہے کہ ہم اپنے عہد باوشاہی میں کچھ گرم ہو گئے تھے۔ غصّے کے مارے ہمارے حلق سے کچھ غیر ضروری آوازیں نکل رہی تھیں لیکن اِس کے باوجود ہمارا ارادہ جارحانہ ہرگز نہ تھا۔ اور کرتے بھی کیا۔ زور و زر کچھ نہ تھا۔ اوپر سے طرہ یہ کہ ساتھ کچھ نہ لائے۔ منّے اور پپّو کو چھوڑ کر وہ سیدھے ہماری طرف بڑھے۔ اور کان میں ایک لوٹنٹی لگائے ہڈیوں اور گوشت کو بالکل قصائیوں کی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ رہے تھے۔ ہمیں ان کی اٹھکیلیاں ذرا بھی پسند نہ آئیں اور اوپر سے ان کے اوٹ پٹانگ سوال سن کر ہم پزل (PUZZLE) ہو گئے تھے۔ اور آج تک ہیں۔ ہم نے چاروں طرف دیکھا کہ شاید ہمیشہ کی طرح آج بھی کوئی ہماری ترجمانی کرے گا۔ مگر نہیں صاحب ہماری اُوں وُوں سے بھی ایک پیچیدہ فلسفہ اخذ کرنے والے آج بالکل خاموش تھے۔ چنانچہ ہر طرف مایوسی کے بادل چھاتے دیکھ کر ہم نے موسلا دھار بارش شروع کر دی۔ اور ان کے ہر سوال کا جواب تیز لے اور ہلکے سروں میں دیا یا پھر مسلسل خاموشی۔ لیکن یہاں جواب جا پلاں۔ خاموشی باشد کی مثال یاد نہ کیجئے۔ اگر یاد آ بھی جائے تو کسی سے ذکر نہ کریں۔ مبادا کوئی ڈاکٹر سن لے۔ اور آپ کے لئے کوئی چالیس پچاس انجکشن تجویز کر دے اور بچپن میں تو خاص طور پر احتیاط کریں

بہرحال صاحب اُن ڈاکٹر صاحب نے جنہیں ہمارے بڑے "داغدار" صاحب کہتے تھے۔ ہمارے ابا کو

ہدایت کی کہ ہمارا جیب خرچ بند کر دیا جائے۔ پس ہمارا حلق ہر قسم کی نعمتوں کے لئے آوٹ آف باونڈ قرار دے دیا گیا۔ اس پر ہم فوراً ہنگر سٹرائک پر چلے گئے اور آتے جاتے رہے۔ یعنی اگر کوئی دیکھ رہا ہے تو چلے جاتے اور اگر کوئی موجود نہیں ہے تو واپس۔ لیکن ایک ظلم ہمارے ساتھ ہوتا ہی رہا۔ یعنی انجکشن

اور ہر دفعہ ہم پکڑ کر اس طرح لٹا دیئے جاتے جس طرح قصائی بکرے کو لٹاتے ہیں۔ پھر ہم نے مثبت نکتہ نگاہ سے سوچنا شروع کر دیا۔ یعنی کہ یہ ڈاکٹر کیا چیز ہوتے ہیں۔ یوں سوئیاں گھونپ دیتے ہیں۔ آخاہ کتنا مزہ آتا ہوگا۔ پھر یکایک ہم نے بھی ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کر لیا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ یہ فیصلہ ذرا خفیہ رکھا۔ کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ لوگ ہمارے طفلانہ خیالات پر ہنسیں۔ آپ بے شک ہنسیں۔ ہمیں پرواہ نہیں

اصل المیے کا آغاز ہمارے مڈل پاس کرنے سے ہوا۔ جب ہم نے اپنے تئیں ڈاکٹری میں داخلہ لے لیا اور پھر یقین کیجئے ایک دن ڈاکٹر ہو گئے۔ اسی طرح خوشی کی حالت میں ذرا سیر کو نکل کھڑے ہوئے۔ ابھی چند قدم ہی گئے کہ وہی ڈاکٹر صاحب مل گئے۔ ہمیں ایسے لگا۔ کہ احساس کمتری میں ان کا سر ذرا جھکا ہوا ہے۔ حالانکہ وہ اکثر ایسے ہی غوطے میں ہوا کرتے تھے۔ غصّہ کی وجہ سے جتنی گالیاں ہم نے انہیں دی تھیں وہ تو یقیناً انہوں نے نہیں سنی تھی۔ لیکن ہمیں اپنی طرف تمسخرانہ انداز میں دیکھتے پا کر انہیں غصّہ آ گیا۔ ہم تھوڑا سا مسکرا دیئے کیونکہ تگڑے کو دیکھ کر ہمیں ہنسی آ جاتی ہے۔ اور کمزور کو دیکھ کر غصّہ۔ اوپر سے تو ہم مسکرا رہے تھے۔ لیکن ہمارا دل چاہ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو اسی طرح لٹا کر اتنے انجکشن دیں کہ ڈاکٹر صاحب اپنی ڈاکٹری، ڈاکٹری آفرین کے سپرد کر دیں۔ یا کم از کم بالغ قسم کے وادرے ہی سن لیں۔

ڈاکٹر صاحب تو چلے گئے۔ لیکن ہم پھنس گئے۔ ہمیں ایسے لگا جیسے ہمارا پُر جوش استقبال ہو رہا ہے۔

اب عوام کو کون سمجھائے

ہم (POPULARITY) نہیں چاہتے۔ مجبوراً مجمع کو کم کرنے کے لئے انجکشن لہرایا۔ ہم ان بھگوڑوں کے تعاقب میں آگے بڑھے تاکہ انہیں اتنی دور تک تو ہانک آئیں کہ یہ پھر ادھر نہ آ سکیں۔ کہ اچانک ایک کرخت آواز آئی " انجم! کدھر جا رہے ہو۔" ہم نہایت ایکٹنگ سے مڑے اور شاید گرجے بھی "خاموش۔ ڈاکٹر انجم کہو ادب کے ساتھ"۔ اور نتیجہ اس کا یہ ہوا۔ ایک دم سے زمین قدموں تلے سے نکل گئی اور ہم قدم رکھنے کے لئے جگہ ڈھونڈھنے لگے۔ اتنے میں والدہ (اب ہم کچھ سمجھنے لگے تھے) چلائیں "ہائے میرے لعل کو کیا ہو گیا ہے۔ کسی نے کچھ کر دیا ہے"۔

چنانچہ ایک بڑے (جسمانی لحاظ سے) عامل کو بلایا گیا۔ لہٰذا ہر اس کا ارادہ یہی تھا کہ اگر کسی نے کچھ نہیں کیا تو کچھ کر دیا جائے۔ انہوں نے بالآخر ایک کالا بکرا (میری نسبت سے نہیں) صدقہ کرنے کو کہا۔ ویسے تو اور بھی بہت کچھ فرمایا، مگر یہ فرمانا اب بھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ابا جان نے کچھ عجیب سے فقرے بولے تھے۔ یعنی ابھی تو پری میڈیکل میں ہے۔ اور یہ دشمنوں کا حسد کہ جادو تک پہنچ گئے۔ جب ڈاکٹر بنے گا تو کیا کچھ نہ ہوگا۔ پری میڈیکل۔ ہم کچھ پریشان ہوئے۔ اور سر کے پچھلے حصّے کو ذرا کھجایا۔ مگر پھر خیال آیا۔ یہ "پری" میڈیکل ہی ہے نا۔ پھر بچپن میں پڑھی ہوئی پریوں کی کہانیاں یاد کرنے کی کوشش کی تو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ واہ ہماری تو ہزاروں پریوں سے واقفیت ہے۔ فیصلہ کیا جب کسی پری کے دربار میں حاضر ہوں گے تو اس کے بالوں کی لٹ بھی لے آئیں گے۔ تاکہ آئندہ عملی زندگی میں کوئی دقت پیش نہ آ سکے۔ مگر نجانے کیا گھپلا ہو گیا۔ نویں سے دسویں میں گئے۔ دسویں پاس بھی کر لی۔ مگر کسی پری سے ملاقات نہ ہو سکی۔ پری چہرہ بہت ملیں۔ مایوسی کے عالم میں ایک دن خیال آیا کہ کبھی پریاں اس طرح بھی ملا کرتی ہیں وہ تو جنگلوں وغیرہ میں کسی ڈبیا یا درخت کے تنے میں ہوتی ہیں۔ واہ! واہ خیالات کی بلندی ملاحظہ ہو۔ فوراً آئینہ دیکھا اور پھر جنگل کو چل دیئے۔ جنگل میں جا کر سگریٹ کی خالی ڈبیاں اکٹھی کرتے اور انہیں انتہائی باوضو ہو کر کھولتے۔ یا پری۔ یا پری کا ورد کرتے ہوئے درختوں کو بذریعہ بلیڈ

کاٹتے اور اپنا نام پتہ کھود دیتے کہ اگر پری کہیں بال کٹوانے گئی ہو تو واپسی پر ہم تک پہنچ جائے۔ پھر آبا نے پوچھا "ڈاکٹر بنو گے"

ہم نے شرماتے شرماتے جواب دیا۔ "ہاں" "نہیں نہیں، جی ہاں" اور لحاف میں گھس گئے۔ لیکن ہم ایسی ایکٹنگ کر کے انہیں شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے۔ تھوڑی دیر بعد آبا نے حکم دیا کہ یہاں دستخط کر دو۔ دستخط کرنے کا شوق ہمیں بچپن ہی سے تھا۔ اور دستخط کرتے بھی بے تحاشا تھے۔ نوٹ، سگریٹ کی ڈبیا وغیرہ پر لیکن چیک پر دستخط کرنے کی حسرت ہی رہی تھی۔

> چنانچہ ایک بڑے (جسمانی لحاظ سے نہیں) عامل کو بلایا گیا۔ بظاہر اُن کا ارادہ بھی تھا کہ اگر کسی سے کچھ نہیں کیا تو کچھ کروا دیا جائے۔ بالآخر ایک کالا بکرا (میری نسبت سے نہیں) صدقہ کرنے کو کہا

"اب تم پری میڈیکل میں داخل ہو جاؤ گے" آبا نے مژدہ سنایا۔

"مگر بات دل کو نہ لگی۔ پوچھ ہی بیٹھے۔" آبا جان یہ "پری کیا ہے۔"

والد بولے۔ پری نہیں پرِی۔ اور اس کا مطلب ہے پہلے۔ اور سارے پری میڈیکل کا سارا ہی مطلب ڈاکٹری سے پہلے۔ ادھر ہم تھے کہ روتے بھی رہے۔ ہنستے بھی رہے۔ پھر نہایت تلخ اور گلوگیر آواز سے پوچھا "یہ پری ہم سے کب اور کیسے اترے گی۔" وہ بولے بس یہ سمجھ کر کے دو سال اور ہیں۔ محنت کرو گے تو میڈیکل کالج میں جاؤ گے۔ جہاں ڈاکٹر بنایا جائے گا۔ بس اسی دن سے مذاقِ ڈاکٹری میں محنت شروع کر دی۔ حالانکہ ہم جیسے جینئیں طالب علموں کو پڑھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ پڑھ لیا۔ فلم دیکھ لی ایک ہی بات تھی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ سینما میں دھیان ایک طرف ہوتا ہے اور کمرۂ امتحان میں کئی طرف۔ خیر امتحان ہوئے۔ ہم نے کچھ ایسے تفصیلی اور پُر مغز جواب لکھے کہ "بورڈ" والے شش و پنج میں پڑ گئے کہ یہ پرچے یونیورسٹی بھیج کر ماسٹر کی ڈگری دلوائی جائے اور اگر یونیورسٹی مناسب سمجھے تو ڈاکٹریٹ کے لئے بھیج دیئے جائیں۔ مگر ان دنیا والوں سے خدا بچائے۔ جل ہی تو گئے۔ بالآخر بے انتہا سوچ و بچار کے نتیجہ میں F.Sc. کی سند پر ٹرخا دیا۔ ہم نے بھی جھگڑا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ ایک تو ہم ہیں ہی صلح پسند اور دوسرے ایسی ڈگریاں ہمیں اچھی نہ لگتی تھیں۔ اس سند کا صرف اتنا فائدہ ہوا کہ ڈاؤ میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ ہم نے بھی اسی پر قناعت کی۔ ایثار اور قربانی کا جذبہ ملاحظہ کیجئے۔ فی زمانہ ایسے لوگ کہاں۔ مگر سب قربانیاں رائیگاں گئیں۔ ہوا یہ کہ ایک ہمارا ساتھی کچھ کھانس رہا تھا۔ اُسے دیکھا تو فوراً پوزیشن لے لی۔ نبض دیکھی۔ آنکھیں اور زبان نکلوائی۔ سینے اور کمر میں مکے مارے۔ چیختا چلاتا گانا سنا۔ پھر نہایت افسردگی سے اعلان کیا۔ "اے بھائی تمہیں T.B ہے۔ تیری منزل آ چکی ہے۔ وصیت وغیرہ کر لو یا پھر یہ کراؤ۔ وہ کراؤ اور گھر چلے جاؤ، ورنہ۔" ابھی ہم دھونس جما ہی رہے تھے کہ "سر" آ گئے۔ پیار سے ایک دھپا لگایا۔ پوچھنے لگے "کون سے سال میں ہو؟"

"فسٹ ایر میں"؟

پہلے تو انہوں نے بُرا سا منہ بنایا اور پھر کہا۔ "تم پری کلینکل طالب علم ہو نا تم کیا جانو مرض، مریض وغیرہ کو۔ بھاگو بیوقوف کہیں کے۔"

"یا پری" ہم بے اختیار چیخے۔ "پہلے ہی یہاں پریوں کی کیا کمی ہے جو یہ پری پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔"

مشابہت

اجمل نیازی

"پپو تو بالکل اپنے ابو پر گیا ہے۔ منی ہو بہو امی کی تصویر ہے۔"

"تمہاری آنکھیں فلاں شخص جیسی ہیں اس کی ناک تمہارے طرح ہے۔"

"زید، بکر سے ملتا جلتا ہے۔ رشید پچھلے سے حمید لگتا ہے۔"

اس قسم کے مکالمے کئی بار سننے میں آتے ہیں۔ ان میں کسی حد تک صداقت بھی ہوتی ہے۔ بعض اوقات حیرت انگیز طور پر مشابہت ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات کبھی ایسی نازک صورت اختیار نہیں کرتی کہ پپو بالکل ابو بن جائے اور منی اور امی ایک تصویر کے دو پوز بن جائیں۔ یا جس طرح انسان کی نظر میں سب کوے ایک سے ہوتے ہیں اور ساری چڑیاں ایک جیسی۔ ہو سکتا ہے کوؤں اور چڑیوں کے خیال میں سب انسان ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ کوئی آدمی کوا یا چڑیا نہیں ہو سکتا۔

یہ ایک اٹل اور مسلمہ حقیقت ہے کہ آج سے ہزار سال پہلے ایک آدمی پیدا ہوا اور مر گیا۔ اس جیسا انسان اس شکل و صورت اور چال ڈھال والا انسان آج تک پھر پیدا نہیں ہوا۔ اب دنیا میں اربوں انسان ہیں مگر کوئی انسان دوسرے کی ہو بہو نقل نہیں ہو سکتا۔ کوئی نہ کوئی فرق کسی نہ کسی صورت میں ضرور ہوتا ہے۔ جو انسان کو ایک دوسرے سے ممیز کرتا ہے۔ انسان ایسی ٹھوس چیز نہیں کہ کسی سانچے میں ڈھل کے ایک دوسرے جیسا باہر نکلے۔

ہر انسان ایک انسان ہے وہ اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے اور نہ ہی کوئی انکار کر سکتا ہے۔ البتہ جو انکار کرے اس کے انسان ہونے میں کوئی شک ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اس بات سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ انسان شکل و صورت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ حتیٰ کہ آواز بھی مختلف ہوتی ہے۔ وہ فلپس ریڈیو کی طرح ایک، ہی رنگ، ایک ہی سائز اور ایک ہی شکل کا نہیں۔ اگر کوئی اس قسم کی دریافت کرے تو وہ بہت بڑا جھوٹ ہوگا یا ایک محیر العقول کارنامہ۔ قدرت کا کرشمہ یا معجزہ جس سے عجائب گھر یا چڑیا گھر کی رونق میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

کسی حد تک مشابہت ہوتی ہے۔ بہت حد تک بھی ہو سکتی ہے اور

یہ اکثر دلفریب اور دل فگار مذاق بن جاتی ہے یہ میرا ذاتی تجربہ ہے یہ تجربہ اگر عام ہوتا تو شاید زندگی کا دوسرا نام مذاق ہوتا۔ اصغر نیازی میرے سگے اور جڑواں بھائی ہیں۔ ہم دونوں ہم عمر، ہم جماعت، ہم درد اور کچھ ہم شکل ہیں۔

لوگ کہتے ہیں بلکہ ایک عرصے سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ ہم دونوں بھائیوں کی شکلیں ملتی جلتی ہیں۔ ہم ایک جیسے ہیں ہو بہو ایک دوسرے کی نقل، اغلب گمان ہے۔ لوگ سچ کہتے ہوں مگر اب کان پکڑ کر ایمان لے آئے ہیں۔

"اجی۔ واقعی ہم ایک جیسے ہیں ربالکل رخدا کی قسم۔"

شومئی قسمت سے کبھی ہم کسی ایک جگہ کھڑے ہوں تو لوگ ہمیں بڑی عجیب عجیب اور حیران حیران نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ گھور گھور کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں۔ دیکھ دیکھ کر دیکھتے ہیں۔ پھر دیکھتے ہیں اور دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں کہ ہم دونوں کو پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنا پڑ جاتا ہے۔

"یا اللہ یہ معاملہ کیا ہے۔ ہم کوئی اشتہاری مجرم ہیں۔ کسی دوسری مخلوق سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔ نجانے کن شریف آدمیوں میں آن پھنسے ہیں"

لوگ ہمیں یوں بے دردی سے آنکھیں مل مل کر جھپک جھپک کر بلکہ آنکھیں نکال نکال کر ٹکر ٹکر متواتر اور مسلسل گھورے چلے جا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک آدمی بزرگانہ اور جاسوسانہ انداز میں ہماری طرف بڑھتا ہے۔ ہمارے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ اور ہم اپنے آپ کو مقابلے پر آمادہ کرنے پر اکساتے ہیں۔ سر دھڑ کی بازی لگانے مرنے مارنے کے لئے ایک ایک اور دو گیارہ کے مصداق ڈھارس بندھی رہتی ہے۔ مگر جب وہ مشفقانہ اور رازدارانہ انداز میں پوچھتا ہے۔

"آپ دونوں بھائی ہیں نا"

تو ہم دل ہی دل میں کانپ کر رہ جاتے ہیں۔ اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے۔ بکھر سے گئے۔ یہ ہمیں پہلے سے جانتا ہے۔ بس مارے گئے۔ ڈر ڈر کے جھجک کے بمشکل کہہ پاتے ہیں۔

"جی آپ کو کیسے پتہ چلا۔ خیر فرمایئے کیا کام ہے۔"

تو وہ ہنس کر فرماتا ہے۔"

"بھئی کیا غضب کی مشابہت ہے دونوں بھائی ایک سے"

"بے وقوف" ہماری حیرانی غصے میں بدل گئی ہے۔ کیا فضول آدمی ہے۔ SUSPENSE CREATE کر رہا تھا کمبخت۔

بات یہاں تک ہوتی تو بھی کوئی بات تھی۔ اب وہ حضرت خدا کا نام لے کر ہمارے شجرہ نسب سے لے کر خاندانی حالات اور اندرون خانہ واقعات تک دریافت کرنے پر تلے نظر آتے ہیں۔ اور ہم ہیں کہ دانت پیس کر اور مٹھیاں بھینچ کر غصے کو دبا رہے ہیں۔ کوئی ایک آدمی ہو تو اسے ٹرخایا بھی جا سکتا ہے۔ اب ہر شخص یہی انٹرویو لینا شروع کر دے تو انشاء اللہ آدھی سے زیادہ زندگی اس سوال و جواب اور حیرت و استعجاب میں بیت جائے گی۔ ایسی بھی کیا مشابہت ہے۔ صاف اور واضح فرق ہے مگر ان خواہ مخواہ حیران ہو جانے والوں کو گویا ہوا کہ سبحان اللہ کا ورد کرتے ہوئے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں۔ کوئی ہے خدا کا بندہ جو لاحول ولا اور اعوذ باللہ کا ذکر شروع کر دے۔ تاکہ یہ بلا ٹلے۔ بعض من چلے تو پوری تحقیق فرمانے لگتے ہیں۔

"کیوں جی! اگر آپ میں سے ایک کو تکلیف ہو تو دوسرے کو بھی لازماً ہوتی ہوگی" ہمیں جل کر یہی کہنا پڑتا ہے۔

"صاحب تکلیف تو آپ کو ہو رہی ہے۔ ہمیں کیوں ہونے لگی۔ نہ کوئی "تار برقی ہمارے درمیان رابطہ" قائم کرتی ہے نہ ابھی ایسا وائرلیس سسٹم ایجاد ہوا ہے اور ذہنی غسل ہم نے کرایا نہیں۔"

"نہیں نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ۔ یعنی۔ میں کہنا چاہتا ہوں" وہ بحث پر اتر آتے ہیں۔

"کہ نفسیاتی طور پہ دوسرا آدمی متاثر ہوتا ہوگا۔"

"متاثر کیسے نہ ہو۔ ایک بھائی تکلیف سے مر رہا ہے اور دوسرے کو پرواہ نہیں۔ وہ کیسا بھائی ہوا بھلا۔"

غرض اس قسم کے حادثے آئے دن قدم قدم پر اس کثرت سے

پیش آئے کہ ہم نے اکٹھا رہنا، ایک ساتھ چلنا اور ایک جگہ بیٹھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ مگر اس طرح بھی کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں ایک دن اکیلا خیالوں میں کھویا سر جھکائے اپنی دنیا بسائے بے خود و بے نیاز چلا جا رہا ہوں کہ پیچھے سے کوئی آواز دیتا ہے پھر پکارنے لگتا اور بالآخر چلانا شروع کر دیتا ہے۔ "اصغر صاحب، اجی او اصغر صاحب!" وہاں کوئی اصغر ہو تو جواب دے۔ وہ صاحب غصے سے لال پیلے ہو کر آئیں گے اور آتے ہی برس پڑیں گے۔ "اجی یہ کیا بدتمیزی ہے۔ ہمارا گلا بیٹھ گیا۔ اور آنجناب سنتے ہی نہیں"۔ میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں۔

"جناب میں اصغر نہیں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔"

تو وہ اور سیخ پا ہو جاتے ہیں۔"

"ایک چور اور دوسرا چترا، اتنی بے مروتی پھر ایسی بدمستی مذاق کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ موقع ہوتا ہے۔ لاؤ وہ میری کتاب جو پرسوں لے کر گئے تھے۔"

میرے پاس کتاب کہاں۔ انہیں لاکھ قائل کرنے کی کوشش کروں۔ قسمیں کھاؤں۔ مانتے ہی نہیں! اور ہفتوں ناراض رہتے ہیں۔ بالکل کٹی کر لیتے ہیں۔ ہاں۔ مجھے اور اصغر کو ایک ساتھ دیکھ لیں تو معافی مانگ لیں گے بس۔ اور اتنا نہیں گے کہ دوبارہ مذاق بن جائے گا۔

میں ایک دن کالج میں پیریڈ کے انتظار میں کھڑا تھا کہ فارسی کے ایک پروفیسر صاحب آئے۔ ذرا سخت لہجے میں فرمانے لگے۔ "تم فارسی کی کلاس میں کیوں نہیں آتے۔"

"سر میں فارسی پڑھتا ہی نہیں" میں نے ادب سے کہا۔

"فارسی چھوڑ دی ہے تو نام کٹوا لیتے کہ خواہ مخواہ غیر حاضری لگ جاتی ہے۔"

"جناب! میں نے فارسی لی ہی کب تھی کہ چھوڑ دیتا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ پورے دو مہینے کیا جھک مارتے رہے ہو؟"

"جی میں ان کا بھائی ہوں۔ اجمل نیازی۔"

"اچھا تو اتنی جلدی نام بھی تبدیل کر لیا تم نے، یہ کہا اور اتنا خفا ہوئے اتنا خفا ہوئے کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ میں انہیں کس طرح عرض کرتا اور وہ کیوں مان لیتے۔ اس دن تک ناراض رہے۔ جب تک میں انہیں ہسپتال اصغر کے پاس نہ لے گیا۔

"السلام علیکم۔ یار کمال ہے، میں نے دو دفعہ ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ آپ نے لفٹ ہی نہیں دی" ایک ایسے حضرت نے آڈانٹ پلائی کہ جنہیں خدا کے فضل سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

"میں نادم ہوں جناب اور خادم بھی ہوں، میں نے سمجھا کہ آپ میرے ساتھ والے کو سلام کر رہے ہیں دراصل تعارف نہیں تھا پہلے۔"

مرتا کیا نہ کرتا معذرت کرتے بنی۔

"یہ لیجئے۔ واہ بھئی واہ۔ اتنی جلدی بھول گئے بڑے آدمی جو ہوئے۔"

وہ یوں شکایت کرنے لگے جیسے میرے ساتھ بچپن میں بھیڑ بکریاں چراتے رہے ہیں۔ میں یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے حافظے پہ زور دیتا ہوں کہ ان کو کہاں۔ کب اور کس حالت میں دیکھا تھا۔ مگر کچھ ذہن میں نہیں آتا۔ ہو نہ ہو یہ فلاں صاحب نہیں وہ تو نہیں آں۔۔۔۔۔ آں۔۔۔۔۔ ان کا دل رکھنے کو کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ ہم نے جوہر آباد سے لاہور تک ایک ہی بس میں سفر کیا تھا شاید۔"

اور انہوں نے ایسا توپ شکن قہقہہ چھوڑا کہ میرے دانت بجنے لگے۔ تو پھر جیل میں ملاقات ہوئی ہو گی یا پھر جہنم میں ملاپ ہو گا۔ خود بخود کڑھنا اور اپنے آپ کو کوسنا پڑا۔

وعلیکم السلام۔ خیریت ہے جناب

ٹھیک ٹھاک۔

"دیکھئے معاف کیجئے۔ مجھے یاد نہیں آرہا۔ آپ فرمادیجئے۔ میرا حافظہ ذرا کمزور ہے۔"

انہوں نے بچوں کی طرح سمجھاتے ہوئے انکشاف فرمایا۔ اور یوں دیکھا جیسے مجھ پر احسان کیا ہو۔

"یار منڈی بہاؤالدین میں قرأت کے مقابلے میں ایک ساتھ شریک ہوئے تھے۔" اور میں سرپیٹ کر رہ گیا۔ میں نے قرآن شریف پڑھا تو ہے۔ مگر قرأت صرف سنی ہے۔ گویا جو قرأت سنے وہ بھی پکا اور پیشہ ور قاری ہوگیا۔ مجھے سوچتا دیکھ کر اور اپنے خیال میں شرمندہ پاکر وہ آگے نکل گیا۔ اور میں نے مشابہت کو گالیاں نکال کر غصہ نکالنا چاہا۔ یہ ایسی ڈھیٹ چیز ہے کہ کئی بار نکالنے پر بھی نہیں نکلتی۔

مجبور محض ہو کر میں نے عادت ثانیہ بنالی کہ کوئی بھی ملے سلام کرے خواہ اسے پوری طرح دیکھا بھی نہ ہو اور نہ دیکھنا چاہا ہو۔ فوراً بے سوچے سمجھے رٹے ہوئے سبق کی طرح پورے زور سے گردان شروع کر دیتا ہوں۔

"وعلیکم السلام۔ خیریت ہے نا جناب۔ ٹھیک ٹھاک۔ مزاج بخیر۔ کوئی اصغر کا دوست ہوگا۔

مگر یہ پچیس سالہ منصوبہ بھی ناکام رہا۔ برا ہو اس مشابہت کا۔ دن کا سکوں اور رات کا چین حرام کر دیا ہے میں جی ہی جی میں خوش تھا کہ اس طرح یہ مصیبت ٹل جائے گی۔ کسی وقت اصغر بننا پڑ جائے تو بے دھڑک بن جاؤ۔ ایسے دہشت پسند سچ سے یہ پرامن جھوٹ اچھا بھی ہے اور مفید بھی۔ لوگوں کو الو بناؤ اور اپنا الو سیدھا کرو۔ چنانچہ میں نے فرض کر لیا کہ میں اجمل کم اصغر زیادہ ہوں۔ اسی انتقامی جذبے کے زیر اثر اصغر کی عدم موجودگی میں اس کے وظیفے کی رقم بڑی آسانی سے وصول کر لی۔ کیونکہ اصغر نے اپنے نشتاختی کارڈ پر میری تصویر لگائی ہوئی تھی۔ اس دن وہ خوشی ہوئی کہ کیا بتاؤں۔ لیکن "ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کسے" اصغر کے سارے ادھار بھی اس غریب کو چکانا پڑے اور نقصان کی شرح فائدے سے کہیں زیادہ ہو گئی کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا لیکن وہ گردان پھر بھی یاد نہ رہی اور ایک دفعہ جب ایک لڑکے کے سلام کرنے پر میں نے جھٹ گردان شروع کر دی تو وہ ہکا بکا رہ گیا اور میں بھی کہ شاید یہ حقیقت حال جانتا ہے

"کیا بات ہے۔ نیازی صاحب! کل تک صلح کی ہر کوشش ٹھکرا دی اور آج یونہی من بیٹھے۔ خیر تو ہے۔" نصیب۔ دشمناں، کس کی لڑائی۔ کیسی صلح، میرے فرشتوں کو خبر نہ تھی میں کھڑا اس کا منہ تکتا رہا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ واقعی اصغر سے کچھ ان بن تھی۔ وہاں مذاق کا نشانہ یہاں غصے کا شکار۔ اللہ رحم کرے۔ شاید وہ ابھی اس قسم کا رحم کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔

اسی طرح خدا کی پناہ مانگتا جونہی میں جماعت کے کمرے میں داخل ہوا۔ میری کلاس فیلو نے میرا اپنا رسالہ اس بے چینی سے مجھے واپس کیا جیسے بھیک دے رہی ہو۔ شکریہ ادا کرنے کی بجائے وضاحت طلب کی۔

"عجیب بھائی ہیں آپ کے۔ سب کے سامنے مجھے ڈانٹ پلا دی۔ ان سوشل۔"

"اوہ چپ" میں نے اس کی بات کاٹ لی۔

"آہستہ بات کرو۔ سن لیا تو قیامت آجائے گی۔ شکر کرو۔ پٹنے سے بچ گئی۔"

"میں نے گالی تو نہیں دی تھی۔ میں انہیں آپ سمجھ کر رسالہ واپس کر رہی تھی کہ ....."

"میں کوئی" وہ" ہوں کہ آپ نے سمجھ لیا۔ یہی سمجھا تو کیا خاک سمجھا" میں نے اسے چڑانے کی کوشش کی۔

"ہٹو۔ چھوڑو تم بڑے" وہ" ہو" وہ سچ مچ چڑ گئی۔

"بڑا" وہ" یا چھوٹا وہ۔ بہرکیف وہ" وہ" نہیں" میں نے کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"شکل جو ملتی ہے میں کیا کرتی۔"

یہ سن کر جو مجھ پر گزری بس گزر گئی۔ بات کا سارا مزہ کرکرا

ہو گیا۔ ادھر صوفی اصغر الگ ناراض کہ تم نے لڑکی کو رسالہ دیا ہی کیوں۔ جائیں تو جائیں کہاں کہ اس مشابہت کے ہاتھوں سربستہ راز بھی طشت از بام ہو گئے۔ اب خود ہی کہیں چھپ جائیں تو جان چھوٹے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ میں نے اصغر کی منت سماجت کر لی۔ پاؤں پڑا۔ کہ خدا کے لئے گھر میں ذکر نہ کرنا۔ اور میں نے جان کی خیر مانگ لی۔ مگر کب تک خیر مناتے۔ ایک دن تو واقعی جان کے لالے پڑ گئے۔

میں گھر سے نکل کر بس اسٹاپ پر پہنچا ہی تھا۔ کہ ایک جانے پہچانے صاحب دو دو آدمیوں سے خود کو چھڑانے اچھل اچھل پڑتے جھاگ بہاتے مکا تولتے اور اقبال فول بکتے نظر آئے۔ میں بھی آگے بڑھا کہ دیکھوں۔ کیا ماجرا ہے۔ وہ بوجھ بجھکڑ کاغذی پہلوان آمجھ سے ٹکرایا۔ اب مجھے ہوش آیا کہ یہ سب تکلف میرے لئے کیا جا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ اسے چھوڑ دیجئے اور سامنے دیجئے کہ ان سے پہلی ملاقات ذرا اچھی طرح ڈٹ کر اور تاریخی طریقے پر ہو جائے۔ لوگ اکٹھے ہوئے۔ شور و غل بلند ہوا۔ اور بیچ بچاؤ ہو گیا چند لوگ مجھے وہاں سے کھینچ کر دور ہٹا لے گئے اور میں پوچھتا ہی رہ گیا۔ کہ یہ حضرت ہیں کون صاحب۔ مگر کسی نے نہ بتایا۔ گھر آئے تو پتہ چلا کہ اصغر سے کسی معاملے پر مار کھا چکے ہیں اور اس وقت بدلہ لینے کے موڈ میں تھے۔ یعنی اصغر کے گناہ میرے سر۔ کانٹے وہ بکھیرے اور چنیں ہم۔ ہم اصغر بن کے اصغر کے بھنبھٹ چڑھ جائیں اور وہ گھر بیٹھا تلاوت قرآن مجید کیا کرے۔ ہماری روح کو ثواب پہنچانے کے لئے۔ گویا کرتوت اصغر کی ہو اور خمیازہ ہم بھگتیں۔ اچھا بھئی یونہی سہی۔ واہ خدایا تیرا انصاف آہ مشابہت تیری مہربانیاں۔

میں یہ درد بھرے لذیذ واقعات کب تک سناتا رہوں۔ کہ اس کے طفیل مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے خواہ مخواہ یونہی راہ چلتے وقت میں ناحق تماشا بن جانا کوئی کم توہین ہے۔ کیا کالج میں مجھے دیکھ کر ایک طالب علم اپنے ساتھیوں سے میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ کہ روز کے روز کپڑے تبدیل کرنا تو ایک رواج ہوا اب دن میں بھی کئی بار کپڑے بدلنے کا فیشن چل نکلا ہے۔ خون کھول اٹھا۔ میں وہ شخص ہوں کہ ایک ہی لباس ہفتوں تک چلتا ہے کالج سے گھر جا کر کپڑے اتارے اور دوسرے پہن لئے۔ اس طرح اپنی سفید پوشی کا بھرم رہ جاتا ہے۔ جسے فیشن کی ہوا نہ لگی اسے پکا فیشن ایبل بنا دیا۔ کاش انہیں کوئی تو بتاتا کہ میرے پاس ایک بلیزر ہے جو ابا جان نے فرض سمجھ کے سلوا دیا۔ ایک شیروانی کہ جس سے بڑے بھائی جان رکتے گئے تو وہ میرے حصے میں آئی۔

تیرے خزانوں میں کوئی کمی نہیں

تو ان سب کو ایک ایک عینک

عطا فرما "آمین"

"راوی" میں پچھلے سال ایک مضمون کمرہ نمبر ۶۰۱ شائع ہوا جس میں اس کمرے کے باشندوں کی شخصیت کا جائزہ لیا گیا تھا۔ جن میں ایک اصغر نیازی بھی تھا وہ بھی اس کمرے میں ان دنوں گوشہ نشین تھا۔ مضمون میں صرف نیازی صاحب لکھ کر اس کے ساتھ چند دلچسپ مگر خطرناک باتیں وابستہ کی گئیں کہ نیازی صاحب سیٹما میں بیٹھے کوئی اندوہ گیں اور المناک منظر دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیتے ہیں۔ گاؤں میں انہیں ایک لڑکی کے ساتھ عشق ہو گیا تھا۔ اس کی یاد میں ابھی تک راتوں کو خوابوں میں ڈر جاتے ہیں

بدقسمتی یا خوش قسمتی سے میں راوی کی مجلس ادارت میں ہوں۔ اصغر کو ذرا کم لوگ جانتے ہیں۔ ویسے بھی وہ قلندر مزاج، صوفی منش اور درویش صفت انسان ہے۔ چنانچہ مذکورہ نیازی صاحب، بلاچون وچرا ہے۔ اور میری فوراً سے پیشتر سے پہلے اس بدنصیب کو سمجھ لیا گیا۔ اور میری بابت کسی ان کہے قصے۔ ان سنے واقعے ان دیکھے حادثے اور ان جانے ولولے مشہور ہو گئے۔ یہ بات زبان زد عام ہوئی۔ اور میں رسوائے زمانہ، مختلف ذائقوں

کے تبصرے، قسم قسم کی نکتہ چینیاں، رنگ رنگ کی پیش گوئیاں اور طرح طرح کے لطیفے ہر زبان پر ہر مقام پر ہر آن اور ہر لمحہ دھرائے جانے لگے۔ میں راتوں کو خوابوں میں تو کیا ڈرتا۔ البتہ دن کو تارے نظر آنے لگے۔ اور دن دھاڑے جیتے جاگتے خوابوں میں پڑنا شروع کر دیا۔ یار لوگوں نے اسے بھی کچھ اور ہی فرض کر لیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں بلکہ ایک منہ اور کئی کئی باتیں۔ سن سن کر کان پک گئے۔ اور میرے لئے کالج آنا ایک مسئلہ بن گیا۔

گاؤں میں ہم نے صرف احترام کرنا اور خدمت کرنا سیکھا تھا۔ اور تجربہ ہوا تو صرف امی کی جھڑکیوں، ابا کی جوتیوں، دادا کی گالیوں اور ماسٹر جی کے ڈنڈوں کا ہوا۔ عشق وشق جانتے کچھ نہ تھے۔ صرف ہیر رانجھے کا قصہ سنا تھا اور وہ بھی مسجد میں پوچھنے کی ہم میں جرأت نہ تھی کہ اے بھلے لوگو۔ کچھ تو کہو کہ یہ عشق کون شریف آدمی ہے۔ کہاں کا رہنے والا ہے۔ کب پیدا ہوا اور آج کل کیا شغل ہے۔

ممکن ہے مولوی صاحب سے دیوان حافظ پڑھتے ہوئے صوفی اصغر پر عشق حقیقی کے اسرار عیاں ہوتے ہوں اور اس نے چپکے سے چھپ چھپ کے دور دور رہ کے کسی لڑکی کے ساتھ یہ تجربہ کرنے کی کوشش کی ہو۔ مگر اب ان مجنوں کے سوتیلے نواسوں کو کون سمجھائے کہ نادانو! تم نے صرف عشق مجازی کیا ہے۔ عشق حقیقی کا مزا چکھا ہی نہیں۔ ان میں سے ہر ایک نہایت دلچسپی سے ہونٹوں پر زبان پھیر کر ہوائی مزا لیتے ہوئے پوری تفصیلات مع جزئیات کے پوچھنا چاہتا ہے۔ کیسی لڑکی تھی۔ کس رنگ کی تھی۔ عمر کیا تھی۔ قد کتنا تھا۔ آنکھیں چھوٹی تھیں کہ بڑی۔ کون کون سی باتیں کس کس طرح کرتی تھی۔ عشق ہوا کس طرح۔ کچھ حاصل بھی ہوا یا یونہی دھوپ سینکتے رہے۔ اب کیا پرائرس ہے۔ سکوپ کیا ہے۔ ہمارا بھی تعارف کرا دو یار۔

میں ان سب سوالوں کے جواب میں اس کے علاوہ اور کیا کروں کہ پہلے بے ارادہ جی بھر کے ہنسوں اور پھر بے ساختہ دل کھول کر روؤں۔ دادی امی کی کہانی کے محترم کردار بڑھیا کی طرح۔ خوشی اس بات کی کہ پہلی بار کسی لڑکی پر میرا پیدائشی اور فطری حق ملکیت تسلیم کیا گیا۔ ورنہ میری قسمت میں وقت سے پہلے یہ نعمت کہاں۔ اور رونا اس بات پر کہ یہ طعنے، چبھتے ہوئے فقرے اور زہریلے آوازے میری جان لے کر ہی ٹلیں گے۔

عشق فرمائے اصغر اور وصال مجھے نصیب ہو پھر تو سب خیریت ہے کہ ہر عاشق صادق کے ساتھ یہ ہوتا چلا آیا ہے۔ عشق کا پھل وصول کرے اصغر اور رسوائی، بدنامی اور بے عزتی ہو اپنی۔ یہ کہاں کا اصول ہے جی۔ میں کوئی اتنا ہی لاوارث ہوں کہ جان پر بھی بن آئے اور محرومی و مایوسی الگ۔ ہائے اس نہ معلوم صاحبزادی کو کوئی شریف آدمی میرا حال زار کہہ سناتا تو ممکن ہے۔ مگر یہاں ہر شریف آدمی میرا رقیب بن گیا۔ علیٰ ہذا القیاس ایک استاد محترم نے بھی بھری کلاس میں میری طرف انگشت شہادت کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ کوئی عشق کرنا ان سے سیکھے۔ شرافت سے، سلیقے آرام سے گاؤں میں کر لیا۔ نہ کچھ روک ٹوک اور نہ کسی کو کانوں کان خبر۔ اللہ اللہ خیر سلی۔ خدا نصیب کرے۔ آمین۔ بھلا شہر میں کیا دھرا ہے۔ حسن میں تصنع اور تکلف۔ عشق میں تردد اور تعجب۔ نہ وہ عشق میں رہیں۔ گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں۔ شوخیاں۔ اوئے پنڈ دیاں مٹیاراں۔ مکھناں دیاں بلیاں اور شہر۔ یہاں لسی بھی نہیں ملتی۔ ساری کلاس میں قہقہے گونج گونج گئے اور میرے لب پر اپنے ہی بھائی بند دل جلے عاشق نامراد حضرت میر کا مصرعہ جاری ہو گیا۔

چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

صورت حال نازک سے نازک تر اور نازک ترین ہو گئی۔ اور تو سب کچھ مقدر کی ستم ظریفی جان کر برداشت کیا اور صبر جمیل سے کام لیا۔ اب کیا یہ بھی چپکے سے بھلے مانسوں کی طرح سہہ لیں کہ ہمیں خالصتاً ذاتی حقوق سے محروم کر دیا جائے۔ پوری کلاس پکنک پر گئی۔ کھانے کے بعد ایک کیلا اور دو دو مالٹے دیئے جانے لگے۔ دھینگا مشتی ہوئی۔ میں اپنا حصہ لینے آگے بڑھا تو بجائے کیلے اور مالٹوں کے یہ جواب ملا۔

"تمہارے ابو نے لیا تھا پہلے او فیشنی چوکیدار!"

"مفت تھوڑی لے رہا ہوں۔ میں بھی گرم ہو گیا۔"

"جی ہاں تمہارے چچا کو دیا تھا۔ حرام خور" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "تکرار بڑھتی گئی۔ بات پروفیسر صاحب تک پہنچی کہ اتنے میں اصغر آ گیا۔ تب مجھے اپنا حصہ ملا۔ یہی وہ چچا تھا۔ کاش لوگ اس رشتے کی نزاکت کو سمجھتے۔

پھر وہ ڈاکٹر صاحب جو کشمی پریکٹس کرتے ہیں۔ مجھے کوئی نہ کوئی مرض لگا کے رہیں گے خواہ وہ دماغ کا ہی کیوں نہ ہو۔ اصغر بھائی کے معالج رہے ہیں۔ جب بھی مجھے ملتے ہیں ہر دفعہ یہی کہتے ہیں۔

"سناؤ بھئی اصغر میاں! تمہارے پیٹ کے درد کا کیا حال ہے۔"

میں انہیں ایک سو ایک مرتبہ بتا چکا ہوں کہ میں اصغر نہیں ہوں۔ نجانے کس مٹی سے بنے ہیں کہ ہر مرتبہ بھول جاتے ہیں اگر چپ ہو رہوں تو دو گھنٹے الم غم الا بلا مفت قسم کے مشورے اور ہدایات سنوں۔ جس کا پالا ایسے ڈاکٹر سے پڑے اس کا خدا ہی حافظ ہے اس کا حال خدا نے چاہا تو قبر میں منکر نکیر ہی پوچھیں گے اور اگر منکر نکیر بھی بھول گئے تو پھر خیر کوئی بات نہیں۔ فائدہ مجھے ہو گا۔ کیونکہ اصغر نیک آدمی ہے۔ اور میں۔۔۔۔؟ اپنی تعریف اچھی نہیں ہوتی۔ مجھے تو آپ جانتے ہی ہیں۔ مگر سنا ہے۔ بزرگوں سے کہ خدا بڑا رحم دل اور منصف مزاج ہے کہ کسی پر سب دن ایک سے نہیں رہتے۔ خدا خدا کر کے وہ وقت آ گیا۔ اور اصغر بھائی نے ڈاڑھی رکھ لی۔ ہم نے سوچا کہ خدا نے ہماری بھی سن لی۔ چلو چھٹی ہوئی اور میں اتنا خوش ہوا اتنا خوش ہوا کہ بس خوش ہو گیا اور یوں بے نیازانہ طرز عمل اختیار کیا۔ جیسے پہلے کچھ ہوا بھی نہیں تھا۔ لیکن وہی بات ہوئی کہ دن ایک سے نہیں رہتے۔ اور بھلے دن پھر سے اُڑ گئے۔ گو یا تھے ہی نہیں۔ ہوا یوں کہ اچانک غیر متوقع طور پر ڈرامائی انداز سے ایک مولوی صاحب نے مجھے آلیا۔ اور یوں دیکھا کہ جیسے کچا ہی کھا جائے گا۔

"بڑا ظلم کیا یار۔ بڑے کم ہمت نکلے۔ بزدل۔ بدتمیز بڑے ہی ذلیل، چھوڑو کہ تم سے ہاتھ ملانا بھی جائز نہیں۔"

اب میرے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔

"کیا گناہ عظیم سرزد ہوا مجھ سے، کس کے سانحہ دیکھ لیا۔ حضور" میں ضبط نہ کر سکا۔

میں سر جھکائے کھسک آیا

"سنت رسولؐ کا مذاق اڑا کے تم اتنے بے باک ہو گئے ہو۔" مولوی صاحب کی آواز بھرا گئی۔

میرا دل بھی بھر آیا۔ اور میں سر جھکائے کھسک آیا۔ سوچتا ہوا کہ مشابہت کے صدقے میں کیا کیا نہ ہوا۔ دوسرے روز میں نے کیا دیکھا کہ مولوی صاحب اصغر کی ڈاڑھی پکڑے زور زور سے ہلا رہے تھے۔ نقلی ڈاڑھی۔ واہ بین الاقوامی بہروپیے۔ بزکاری جادوگر روحانی مداری دغیرہ وغیرہ۔

ظلم یہ ہوا کہ ایک اچھے بھلے شریف آدمی نے اصغر کی پارسائی سے متاثر ہو کر ڈاڑھی رکھی تھی مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ بات تک نہ کی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ غصے میں آ کر اپنی ڈاڑھی اس لئے منڈھوا لے گا کہ خوانخواستہ اصغر نے ڈاڑھی منڈھوا لی ہے۔ مگر اطلاعاً عرض ہے صوفی اصغر کے حلقہ بگوشوں کو کہ ان کی ڈاڑھی ماشاء اللہ خدا کے فضل سے صحیح وسلامت، زندہ و پائندہ اور رواں دواں ہے۔

اس سارے ڈرامے کے بعد جب میں گھر پہنچا ہوں تو میری اڑھائی سالہ ننھی منی بہن میری ٹانگوں سے لپٹ جاتی ہے۔ بھائی جان راحل، اجمل آ گیا۔ اور وہ کون ہے۔ میں اس سے ہمیشہ پوچھتا ہوں۔ تو وہ غور سے دیکھے بغیر کہتی ہے۔ او، اہل اصغر ہے اور میں گڑگڑا کے خدا کے حضور دعا مانگتا ہوں کہ دونوں جہانوں کے پالنے والے زمین و آسمان کے مالک

تیرے خزانوں میں کوئی کمی نہیں۔ تو ان سب لوگوں کو ایک ایک عینک عطا فرما!

آپ سب مل کر کہیں "آمین"!

بات کرنی مجھے مشکل...

شمیم اختر

"سخت بدتمیز ہو تم۔ بد ذوق" انجم نے چڑ کر کہا۔

بہت حیران کن انکشاف تھا یعنی ہم اور بد ذوق؟۔ بات صرف اتنی تھی کہ آج جب ہم انجم کے پاس پہنچے تو محترمہ بار بار دوہرا رہی تھی۔

"آخر اس درد کی دوا کیا ہے"

اور ہم سال دوئم کے طالب علم ہونے کے باوجود اپنی علمیت کا رعب جھاڑے بغیر نہ رہتے تھے۔ لہذا پوچھا کہ کبھی بتاؤ بھی تو کہاں درد ہے۔ اس پر انہوں نے ہمارے اوپر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی اور بتایا کہ وہ غالب کا شعر پڑھ رہی تھیں

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اس پر ہم نے انھیں بڑی سنجیدگی سے مشورہ دیا۔ کہ کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ لو۔ جواباً انہوں نے ہمیں بد ذوق کہدیا۔

بات صرف اتنی نہیں۔ ہماری زبان شروع سے چلتی تھی ہماری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ لوگوں کو اپنی معلومات سے نوازتے رہیں۔ اور لوگوں کو ہمارے صحیح الدماغ ہونے پر شبہ ہونے لگا ہے۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ غلط بات سنکر نہیں رہا جاتا۔ ان خطابات کی ابتدا اس دن سے ہوئی جب ہمارے بھائی جان حسب معمول اپنا مخصوص نعرہ "بھوک لگی ہے" لگا رہے تھے۔ واضح رہے کہ یہ نعرہ کھانا وغیرہ کھانے کے بس بالکل چند منٹ بعد لگایا جاتا ہے ہم نے پوچھا "جو مل جائے کے اصول پر ہر چیز کھاؤ گے یا کوئی خاص چیز؟"

کہنے لگے "تم واقعی بیوقوف ہو۔ ظاہر ہے کوئی اچھی چیز۔"

ہم خوش ہو گئے کہ اندازہ بالکل درست تھا۔ "بھوک وغیرہ کچھ نہیں لگی۔ آپ کو"

"تمھیں کیا پتا" وہ چلائے۔

وہ واہ کیسے نہیں پتہ یہ بھوک نہیں ہے بلکہ APPETITE ہے دراصل ایسی ٹائٹ میں یہ ہوتا ہے کہ ....

اور وہ "دماغ مت کھاؤ" کہکر آگے چلدیئے۔ ہمیں یہ افسوس نہ تھا کہ ہم بولنے نہ پائے بلکہ یہ کہ انہوں نے ایک صحیح بات نہ مانی۔ واقعی سچ بولنا کس قدر مشکل کام ہے

اپنی بے بسی کا احساس

اس دن شدت سے ہوا۔ جب ہم نے چھوٹی بہن کو بار بار پیاس لگنے پر کہدیا تھا کہ دیکھو تمہارے دماغ میں جو "HYPOTHALMUS" ہے وہ اس وقت کچھ ضرورت سے زیادہ ACTIVE ہو گیا ہے اور اس کے بعد یہ ہوا کہ ہمیں متفقہ طور پر پاگل قرار دیدیا گیا جبکہ ہمیں یقین ہے کہ ہم نے غلط نہیں کہا

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

صرف یہی نہیں کہ گھر والے ہم سے نالاں ہیں بلکہ ہم اپنی پیاری پیاری دوستوں سے بھی ایک ایک کر کے ہاتھ دھوتے جا رہے ہیں ابھی چند دن پہلے شاہدہ کو فون کیا۔ وہ بولی۔ شمیم میرا دل کہہ رہا تھا کہ فون ضرور تمہارا ہی ہوگا۔ ہم سے ضبط نہ ہو سکا اور کہا دیکھو شاہدہ تم نے ضرور ایسا سوچا ہوگا۔ لیکن دل کا کام تو سارے جسم میں خون تقسیم کرنا ہے اور جواب یہ ملا کہ خدا کے لئے بور مت کرو۔

کل نسرین ملی تو اس نے ایک بہت خوبصورت شرٹ پہن رکھا تھا۔ ہم نے کہا ہائے اللہ نسرین تمہاری قمیض کا ڈیزائن کتنا پیارا ہے بالکل جیسے جیسے .....

اور ہمیں کچھ یاد آگیا لہذا خاموش ہی رہنے میں عافیت سمجھی نسرین کی آنکھیں شرٹ کی تعریف سن کر چمک اٹھی تھیں بولیں، ہاں ہاں کہو بالکل جیسے جیسے۔

ڈرتے ڈرتے کہا کہ گلابی اودے رنگ اور یہ ڈیزائن بالکل جیسے LIVER کا T.S اور چونکہ---

اور نسرین جلدی سے پاس کھڑی لڑکیوں کو ہمارے دماغ پر بھوت سوار ہو جانے کے بارے میں بتانے لگیں۔

گھر میں سب ہی ہم سے چڑ گئے تھے۔ لیکن بہر حال ہمارے اباجی نے کبھی ان کی باتوں پر دھیان نہ دیا۔ لیکن آخر ایک دن ایسا بھی آگیا کہ انہوں نے بھی دوسرے تمام لوگوں کی باتوں پر یقین کر لیا ہوا یہ کہ اس دن رات کو اباجی نے کہا، لو بیٹے کیلا کھالو۔

اور ہم نے تقریباً ہاتھ بڑھا ہی دیا تھا کہ پلٹے اور کتاب نکالی جلدی سے کیلے کی "HEAT ENERGY" چارٹ میں دیکھی۔ پھر صبح سے اب تک جتنا کچھ کھایا تھا اس کا حساب لگایا۔ اور پھر کیلا کھانے سے معذوری ظاہر کی ہمارے اس جمع تفریق نے اباجی کو ہماری طرف سے بدظن کر دیا۔ حالانکہ ہم نے انھیں بتایا کہ اوسط درجے کے طالب علم کے لئے جتنی توانائی درکار ہے وہ ہم لے چکے ہیں لیکن انہوں نے گھر والوں سے مخاطب ہو کر صرف اتنا کہا "تم لوگ ٹھیک ہی کہتے تھے"

● ●

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

بلبل شوریده

بُلبُلِ شوریدہ

"بلبلِ شوریدہ" کون ہے؟

انسان، جو صدیوں سے زندگی کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے یا
زندگی، جو صدیوں سے انسان کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے
اچھائی، جس کی قدر نہیں کی جاتی یا
برائی، جس کا احساس مٹتا جا رہا ہے۔
تہذیب، جس کی اقدار بدلتی جا رہی ہیں یا
اقدار، جو تہذیب میں نہیں ڈھل رہیں
حُبّ الوطنی، جو ناپید ہے یا
حُبّ النفسی، جو وافر ہے
جرأت اور دیانت، جس کا قحط ہے یا
بزدلی اور بددیانتی، جو کوئی برائی نہیں
غور کیجیے، "بلبل شوریدہ" کون ہے
کیا وہ نہیں جہاں ہر چیز کے تاریک پہلو اکٹھے ہو چکے ہیں۔

مدیرِ اعلیٰ

جگر مرادآبادی
سرور بارہ بنکوی
حمایت علی شاعر
قتیل شفائی
اقبال صفی پوری
سعید احمد صدیقی

ڈاکٹر حشمت آرا، حجاب
زہرہ اشتیاق

جیلانی کامران
مظہر رب صدیقی
نصیر ترابی

معصوم اصغر
مرزا محمد مجاہد
محمد ارشد ندیم

جاوید احمد زکریا
خالد فاروقی
اطہر صدیقی اطہر
سید عبدالماجد
انجم سلیم طلعت
محمد امین وقار

نسرین قریشی
انجم آرا منتظر
شمیم اختر
شاہین بانو حنا
جمیلہ فردوس

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِهٖ ✤ کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِهٖ

آپ اپنے کمالات کی بلندیوں پر پہنچے ✤ آپ نے اپنے جمال سے تاریکیوں کو منور کر دیا

حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِهٖ ✤ صَلُّوْا عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ

آپ کے سارے طور طریقے دلکش تھے ✤ درود و سلام ہو آپ پر اور آپ کی آل پر

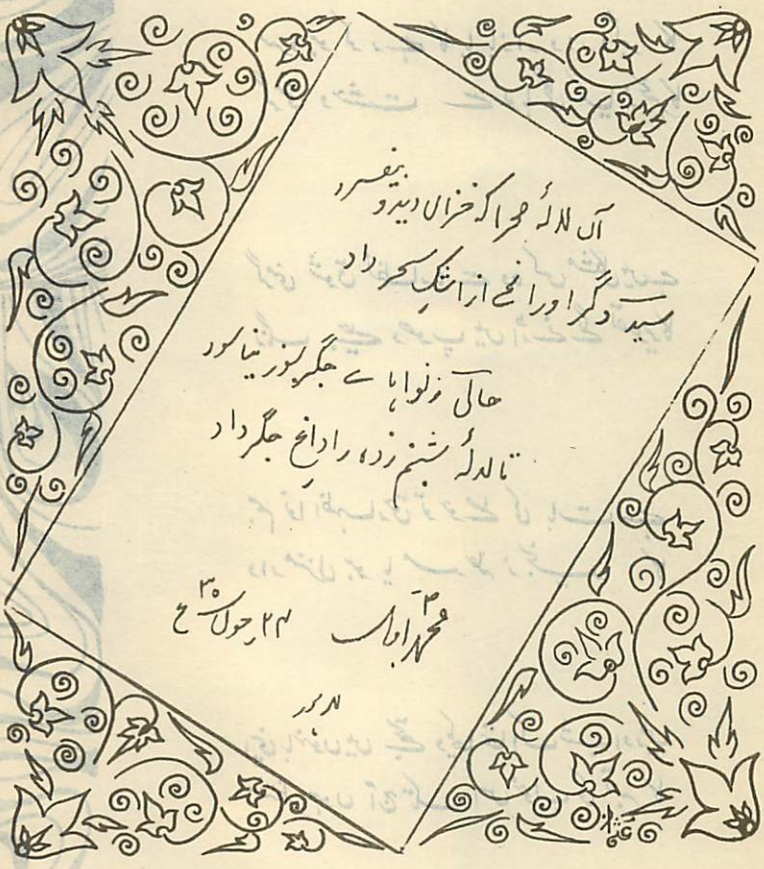

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد
سید دگر اورا نمی از اشکِ سحر داد
حالی ز نواہاے جگر سوز نیاسود
تا لالۂ شبنم زدہ را داغِ جگر داد

محمد اقبال ۲۴ جولائی ۳۵ء

لاہور

سرور بارہ بنکوی

سرد ہو کر رہے گا پا بازار دار و گیر کا
گرمیٔ وحشت سے لوہا گل گیا زنجیر کا

گرمیٔ شوقِ نظارہ سے وہ کس مشکل میں ہے
رنگ جیسے دھوپ میں اڑنے لگے تصویر کا

ہم نوا اظہارِ حق تو حوصلے کی بات ہے
دار منزل ہو یا مرحلہ زنجیر کا

اپنی بانہوں میں تجھے دیکھا تھا اک شب اور میں
منتظر ہوں آج تک اس خواب کی تعبیر کا

ترجمانی کی ہے اپنے دور کی میں نے سرورؔ
میرا فن ہے عکس میرے عہد کی تصویر کا

حمایت علی شاعر

اس دشت پہ احساں نہ کرائے ابرِ رواں اور
جب آگ ہو نم خوردہ تو اٹھتا ہے دھواں اور

سورج کو یہ غم ہے کہ سمندر بھی ہے پایاں
یارب میرے قلزم میں کوئی موج رواں اور

وہ قحط جنوں ہے کہ کوئی چاک گریباں
آتا ہے نظر بھی تو گزرتا ہے گماں اور

یہ سنگ زنی میرے لئے بارشِ گل ہے
تھک جاؤ تو کچھ سنگ بدستِ دگراں اور

شاعر بہ زمیں حضرتِ غالب کی زمیں ہے
ہر شعر طلب کرتا ہے خونِ رگِ جاں اور

جگر مراد آبادی

یہ ہے مے کدہ یہاں رند ہیں یہاں سب کا ساقی امام ہے
یہ حرم نہیں ہے اے شیخ جی یہاں پارسائی حرام ہے

کوئی مست ہے کوئی تشنہ لب تو کسی کے ہاتھ ہیں جام ہے
مگر اس کا کوئی کرے بھی کیا یہ تو مے کدے کا نظام ہے

جو ذرا سی پی کے بہک گیا اسے مے کدے سے نکال دو
نہیں یہاں اہل ظرف کا کام ہے

یہ جناب شیخ کا فلسفہ بھی عجب ہے سارے جہاں سے
جو وہاں پیو تو حلال ہے جو یہاں پیو تو حرام ہے

اس کائنات میں اے جگر کوئی انقلاب اٹھے پھر
کہ بلند ہو کے بھی آدمی ابھی خواہشوں کا غلام ہے

قتیل شفائی

تمہاری انجمن سے اٹھ کر یہ دیوانے کہاں جاتے
جو وابستہ ہوئے تم سے وہ افسانے کہاں جاتے

نکل کر دیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ مے خانہ
تو ٹھکرائے ہوئے انساں خدا جانے کہاں جاتے

تمہاری بے رخی نے لاج رکھ لی بادہ خانے کی
تم آنکھوں سے پلا دیتے تو پیمانے کہاں جاتے

چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

قتیلؔ اپنا مقدر غم سے بیگانہ اگر ہوتا
تو پھر اپنے پرائے ہم سے پہچانے کہاں جاتے

ڈاکٹر حشمت اُرار حجاب

عشرت کدے میں غم کے نظاروں کو دیکھ کر
ہنستے ہیں لوگ درد کے ماروں کو دیکھ کر

آنکھوں سے میرے اشکوں کے دھاروں کو دیکھ کر
اُتری ہیں کشتیاں بھی کناروں کو دیکھ کر

انجامِ زندگی کی طرف مڑ گیا خیال
گلشن کی بے ثبات بہاروں کو دیکھ کر

غرقاب ہونے والا تہہِ آب ہے خموش
حسرت بھری نظر سے کناروں کو دیکھ کر

راتوں کے ہولناک اندھیرے نکھر گئے
اُن میرے آنسوؤں کے ستاروں کو دیکھ کر

بے ساختہ ہنسی مجھے فطرت پہ آگئی
پھولوں کے ساتھ شاخ پہ خاروں کو دیکھ کر

سر پیٹتی ہیں گورِ غریباں میں حسرتیں
بے نور بے چراغ مزاروں کو دیکھ کر

لب پر ہنسی جو آئے تو آئے بھی کس طرح
دل ڈوبتا ہے ڈوبتے تاروں کو دیکھ کر

زخموں کا دل کے ہم نے کیا بارہا شمار
تاروں کی منتشر سی قطاروں کو دیکھ کر

آنکھوں پہ جو فریب کا پردہ تھا اُٹھ گیا
جاتی ہوئی چمن سے بہاروں کو دیکھ کر

اپنی تباہیوں کا یقیں ہو گیا حجابؔ
اجڑے ہوئے قدیم دیاروں کو دیکھ کر

اقبال صفی پوری

آئینہ جب بھی مقابل ہوگا
خود سنبھلنا تجھے مشکل ہوگا
یونہی بے تاب نہیں پروانے
پھول در پردۂ محفل ہوگا
جان کچھ ہوگا بھی پیغام بہار
یا فقط شور سلاسل ہوگا
جائے گا دل سے جہاں تیرا خیال
جو خیال آئے گا قاتل ہوگا
بس یہی ہوگا طلب کا حاصل
کہ ہمیں کچھ بھی نہ حاصل ہوگا

کو پانا ہی نہیں حد طلب
د کو پانا بھی تو مشکل ہوگا
سفینوں کو تو ٹکرانا ہے
سے نکلے تو ساحل ہوگا
کو کتنا ہے شعور منزل
پہ سر منزل ہوگا
جائیں یہ سائے اقبال
مہ کامل ہوگا

شاہین بانو حنا

غزل

نہ ہنسی کی ہے نہ رونے کی صدا میرے بعد
دل کے ویرانے ہیں کوئی نہ رہا میرے بعد
تجھ سے خیر شکایت کی جسارت ہی کہاں
مجھ سے دنیا ہی نے منہ موڑ لیا میرے بعد
مجھ سے تو ٹوٹ چکے خیر جفا کے بندھن
اور کس کس سے بندھا عہدِ وفا میرے
آج پھر گل کی قبا چاک ہے پھر غنچے خ
کس سے سرزد ہوا پھر جرم وفا
میرے ہاتھوں کی شفق تھی میرے خ
بڑھ گیا اور بھی رنگ حنا

کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہو یہ مسکراہٹ اس نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہو ہزاروں تارے اس کی آنکھوں کے سامنے ٹمٹما رہے تھے اور پھر یکایک چاند نکلا اور تاروں کی روشنی ماند پڑ گئی۔

"آشی" ایک دفعہ پھر اس کا سر چکرانے لگا اس کے کانوں میں سیکڑوں آوازیں آنے لگیں "آشی آشی"۔

اس نے جھپٹ کر مورتی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو گھسیٹتا ہوا وہ کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا گھنٹیوں کی آواز اس کے کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔

"آشی ..... آشی گر پڑا تو بولتی کیوں نہیں ..... تو بولتی کیوں نہیں ...؟

تو تو کہتی تھی کہ گڑیاں بولتیں ہیں ..... نہیں نہیں تو آشی نہیں ہو سکتی تو تو اس کی خاک بھی نہیں"۔

"آشی آشی" کھڑکی سے سر لگائے کھڑا وہ بار بار یہی دہرا رہا تھا۔

یکایک اس کے ہاتھ سے مورتی گر گئی چھناکے سے مورتی کے ٹوٹنے کی آواز آئی "آشی مر گئی" نہ جانے کہاں سے یہ آواز آئی۔

ایک ٹانگ کو سہارا دے کر وہ کھڑکی پر چڑھ گیا اور نیچے پڑے ہوئے مورتی کے ٹکڑوں کو گھورنے لگا۔

پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور گھنٹیوں کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

ہسپتال میں ایک دلدوز اور بھیانک چیخ گونجی۔

"آشی میں آگیں"

صبح گل و لالہ کے پھولوں میں شانو کی لاش پڑی تھی۔ تازے پھول کی مانند

باقی پھول اس کے سامنے مرجھائے ہوئے نظر آرہے تھے۔

ایک بڑے افسانہ نگار کے پاس ایک نیا لکھنے والا آیا اور کہا کہ میں نے ایک افسانہ لکھا ہے۔ آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔

بڑا افسانہ نگار پڑھنے لگا۔ جوں جوں افسانہ پڑھتا جاتا اس کی مسکراہٹ بڑھتی جاتی ـــــ موصوف کو خوشی ہو رہی تھی کہ شاید ان کا افسانہ پسند کیا جا رہا ہے۔ فرمانے لگے ـــ "ایسے بہت سے افسانے میں نے الماری میں بند کر رکھے ہیں اور ۔۔۔۔

افسانہ نگار کہنے لگا "تو اسے بھی الماری میں بند کر دیجئے"۔

برگ گل اور شبنم کے موتی

محمد شمیم سیٹھ

نجمہ نے شوفر سے گاڑی صاف کرنے کو کہا اور فائل اٹھا کر کمرے کی طرف چل دی۔

آسمانی رنگ کی ساڑھی۔ میک اپ سے عاری چہرہ اور سفید گون میں وہ بالکل دیوی لگ رہی تھی۔ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی وہ کسی رومانی ناول کا عنوان تھی اور نہ ہی سراپا غزل بننے کی کوشش میں اس نے چہرے کے نقوش خراب کئے تھے۔ بس سادہ اور معصوم حسن تھا جو اخلاق وحیا کے پیکر میں ڈھل کر جوانی کی دہلیز میں قدم رکھ چکا تھا۔

ڈرائنگ روم سے گزرتے ہوئے اسے اپنی پھوپھی کی آواز سنائی دی اس نے سوچا پھوپھی کو سلام ہی کرتے چلوں۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس کے قدم دانستہ رک گئے۔ اندر اسی کا ذکر ہو رہا تھا۔

"دیکھو دلہن جاوید اگلے ماہ ٹریننگ مکمل کر کے آرہا ہے۔۔۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کے آتے ہی ہم نجمہ اور جاوید کی منگنی کر دیں۔"

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ آپا۔۔۔۔ آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔"

نجمہ جو کواڑ سے لگ کر ان کی گفتگو سن رہی تھی کانوں کی لو تک سرخ ہو گئی۔ جیسے نیلے آکاش میں رچی ہوئی شفق کی سرخی۔۔۔۔ خوشی سے چہرہ گلنار ہو گیا۔ کانوں میں شہنائی گونجی اور حیا سے عرق آلود ہو گئی۔ ایسی حالت میں پھوپھی کا سامنا کرنا دشوار تھا۔ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور دروازے کی چٹخنی گرادی۔ جیسے کوئی اسکا تعاقب کر رہا ہو۔

جاوید، نجمہ کا پھوپھی زاد بھائی تھا۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کا آئیڈیل۔۔۔ جس کے ہونٹوں پر ہمیشہ شوخ مسکراہٹ رہتی۔ جاوید۔۔۔ وہ دیوتا جسے من مندر میں بٹھا کر وہ پرستش کرتی رہی پجارن بن کر جس کے چرنوں میں محبت کے پھول نچھاور کرتی رہی۔ آج گھر والے اسے جاوید کے ساتھ مذہب کی بنائی ہوئی مضبوط زنجیر میں ہمیشہ کے لئے قید کرنا چاہتے تھے۔ یہ سوچ کر نجمہ بے خود سی ہو گئی۔ اپنے خوابوں کی حسین تعبیر دیکھ کر وہ بے حد مسرور تھی۔ دروازے سے ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ خیالات اسے ایسی دنیا میں لے گئے جہاں وہ سہیلیوں کے جھرمٹ میں زیورات سے لدی پھندی بیٹھی تھی۔ سرخ جوڑے میں سمٹی ہوئی۔۔۔ جیسے بیر بہوٹی۔ مہندی میں چھپے ہوئے ہاتھوں میں چہرہ چھپائے ہوئے دلہن۔۔۔ دل خوشی اور صدمے کا آماج گاہ ایک طرف مستقبل کے حسین تصورات اور۔۔۔ دوسری طرف بابل کا گھر چھوڑنے کا غم۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ اور چھناک سے کھڑکی کے پٹ ٹکرائے۔ تصورات کے نازک شیشے بکھر گئے۔ نگاہ اٹھائی تو

نظریں ٹیبل پر رکھی ہوئی تصویر پر ٹھہر گئیں۔ جاوید اسی مخصوص انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ لاج سے سمٹ گئی۔ ... جیسے کسی نے اسے چوری کرتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ حیا سے بوجھل پلکیں ایک بار اوپر اٹھیں اور ہونٹ پھڑپھڑائے، "جاوید میں تم سے محبت کرتی ہوں ... دل کی گہرائیوں سے ... لیکن میں اظہار محبت کبھی نہ کر سکی۔ کئی بار چاہا مگر میرے پاؤں میں بندھی ہوئی لاج کی بیڑیاں مجھے ایسا کرنے سے روکے رہیں میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ جس آگ میں، میں جل رہی ہوں تم اس کی تپش بھی محسوس کرتے ہو کہ نہیں ... اس کے باوجود بھی جاوید ... میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اور پھر کتاب ماضی کے اوراق یادوں کے دباؤ سے الٹتے چلے گئے۔ وہ ایک سال پیچھے کی طرف لوٹ آئی۔ پھوپھی کے گھر میں خاندان کے تقریباً سب ہی لوگ جمع تھے۔ آج جاوید سول انجینئرنگ کی ٹریننگ کے سلسلے میں ایک سال کے لئے امریکہ جا رہا تھا۔ نجمہ نے بھی آج اپنی خاموش محبت کو زبان دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کئی بار جاوید کا سامنا ہوا مگر وہ جذبہ دل کو الفاظ کا روپ نہ دے سکیں یہاں سے آخر وہ وقت بھی آگیا جب جاوید رخصت ہو رہا تھا۔ عجیب گھٹن کا عالم تھا۔ جدائی کے تصور سے نجمہ بھی بہت غم زدہ تھی وہ نجمہ تم میرے خط کا جواب دو گی نا"، جاوید اس سے مخاطب تھا۔ اس کا دل چاہا کہہ دے وہ پہلے میرے آنکھوں میں لکھی ہوئی تحریر محبت کا تو جواب دیجئے وہ مگر وہ یہ کہہ نہ سکی۔ نظریں اٹھیں۔ نگاہوں کا تصادم ہوا جاوید والہانہ انداز سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئیں۔ نگاہوں کی تپش سے ماتھے پر حیا کے گوہر چمکنے لگے۔ نسوانیت کے مظہر۔ جیسے برگ گل پر شبنم کے موتی ... "یہ آپ کیا دیکھ رہے ہیں"، وہ ہار" جاوید نے گردن میں جھولتے ہوئے لاکٹ کی جانب اشارہ کیا "اور تم کیا دیکھ رہی ہو" جاوید نے اپنے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "جیت" بے اختیار نجمہ نے کہہ دیا اور اس کے عنابی ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

وٹن، گھڑی نے ایک بجنے کا اعلان کیا اور وہ ماضی سے حال کی دنیا میں آگئیں۔ گون اتار کر کرسی پر رکھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی ثمینہ کے کمرے میں چلی گئی ثمینہ ... نجمہ سے دو سال چھوٹی تھی۔ بی اے فائنل کی طالبہ نجمہ جس قدر حساس۔ ذمہ دار سنجیدہ تھی۔ ثمینہ اسی قدر شوخ اور باتونی

صوفے پر پڑے ہوئے بے ترتیب کپڑے اور میز پر بکھری ہوئی کتابیں دیکھ کر نجمہ بڑبڑائی "ثمو بہت لاپرواہ ہو گئی ہے ... آج کل" پھر وہ کتابوں کو میز پر قرینے سے رکھنے لگی۔ دفعتہً اس کی توجہ ثمینہ کی ڈائری پر مذکور ہو گئی۔ ڈائری دیکھنے کے لئے اکثر ثمینہ سے چھینا جھپٹی ہوتی آج ثمینہ کی غیر موجودگی میں اس کی دبی ہوئی خواہش جاگ اٹھی ابھی اس نے چند صفحہ ہی پلٹے تھے کہ ایک نیلے۔ رنگ کا لفافہ ڈائری سے نکل کر پینگ پر جا گرا۔

نجمہ نے تجسس سے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا ..

وجان آرزو ثمینہ۔

اسلام محبت ... تمہارا شکوہ نامہ موصول ہوا اور حسب خواہش فوراً جواب دے رہا ہوں۔ اگلے ماہ کی وسط تک آ رہا ہوں۔ بس کچھ دن اور انتظار کرو۔ آتے ہی امی سے شادی کے سلسلے میں بات کروں گا ... مایوسی کی باتیں تم جیسی زندہ دل لڑکی کو زیب نہیں دیتیں۔ ثمو ... میری محبت تقدیر سے بھی ٹکرانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ نجمہ باجی سے میرا اسلام کہنا ... خدا حافظ

فقط تمہارا جاوید ..

نجمہ کے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ خط کے الفاظ گڈمڈ نظر آنے لگے اور اگر بڑھ کر اس نے کرسی کا سہارا نہ لیا ہوتا تو قالین پر گر پڑتی۔ اس مسافر کی طرح جو تپتے ہوئے صحرا میں سائے کی تلاش میں بھاگتا رہا ہو۔ سورج کی تمازت

نے چہرے کی شادابی جھلسا دی ہو اور پھر اسے ایک سایہ دار
درخت نظر آئے کنارے پر جا کر احساس تشنگی اور بڑھ جائے
بھاگتے ہوئے قدم تیز ہو جائیں مگر وہاں تک پہنچنے سے پہلے
ایک ٹھوکر لگے اور وہ ڈھیر ہو گیا ہو۔

"تو کیا آج تک میں سراب کے پیچھے بھاگتی رہی"
نجمہ نے سوچا۔ خط کا ایک ایک لفظ اس کے
دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ شدت غم سے آنکھیں چھلک
پڑیں۔ خط ڈائری میں رکھ کر وہ لڑکھڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی
تکیے پر سر رکھتے ہی وہ سسکنے لگی۔ دل کا غبار اشکوں کی صورت
آنکھوں سے بہہ نکلا

"میں جاوید اور ثمینہ کے درمیان سنگ راہ نہیں
بنوں گی۔" نجمہ نے ساڑھی کے دامن میں آنسو جذب کرتے ہوئے
سوچا، "وہ پاگل ہو گئی ہے کیا؟... منزل تمہارے سامنے
اور تم منہ موڑ کر راستہ بدل رہی ہے" دل نے سرگوشی کی

"مگر ثمینہ جاوید سے محبت کرتی ہے"

"اور تو جاوید کی پرستش کرتی ہے"

"ثمینہ جاوید کی زندگی ہے۔ جاوید چاند ہے اور
ثمینہ اس کی چاندنی... میں ان کے درمیان حائل ہو کر پرچھائیں
نہیں بننا چاہتی... پرچھائیں... جو ابد سے تاریک ہے
پرچھائیں... جس کی کوئی بھی حقیقت نہیں"...

"جذباتی نہ بن... ثمینہ پر اپنی خاموش محبت
کا راز عیاں کر دے وہ بہن ہے۔ راستے سے ہٹ جائے گی"

دل خود سری پر آمادہ تھا۔

"تو کیا... میں ثمینہ کی مسکان چھین کر اسے اپنے
ہونٹوں پر سجا لوں

ثمینہ کی تمناؤں کا خون کر کے اسے اپنے
ہاتھوں کی مہندی بنا لوں۔ نہیں نہیں... میں اتنی خود غرض نہیں
بن سکتی۔

"پھر یاد رکھ۔ جاوید کو کھو دینے کا احساس کانٹا بن کر تیرے
دل میں چبھتا رہے گا"

"خود غرضی کا کانٹا تجھے کبھی پرسکون نہ رہنے دے گا"

"تو گویا محبت کی اس بازی میں تم ہار گئیں؟" دل نے
آخری حربہ استعمال کیا۔

"محبت... ہاں... میں نے جاوید سے محبت
کی... یک طرفہ محبت... اور اگر یہ بازی ہے تو آج میں
یہ بازی ہار گئی ہوں۔ ہارنا ہی محبت کی معراج ہے۔

"لیکن اپنا گھر جلا کر کوئی کسی کو آگ نہیں دیا کرتا"...
ذہن نے دلیل دی تھی۔

"لیکن تجھ سے آگ مانگ کون رہا ہے؟"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہی اس سوال
کا جواب تھا۔ آنسو۔ اعتراف شکست کے آنسو۔

سورج کی سنہری کرنیں شیفون کے باریک پردوں سے
چھن کر کمرے کے عقبی حصے کو بقعۂ نور بنا رہی تھیں"

نجمہ جب منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو موسم کا رنگ ہی
بدلا ہوا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں کیا سے کیا ہو گیا۔ کالے کالے
بادل مست ہاتھی کی طرح آسمان پر جھوم رہے تھے ٹھنڈی
ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے نجمہ کو سکون کا احساس ہوا
چہرے پر وہی تقدس تھا جس میں جذبہ ایثار کی چند لکیریں
اس کے سوگوار حسن کو اور بھی نکھار بخش رہی تھیں۔

"پھر دن گزرتے گئے"

"نجمہ بیٹی جلدی سے تیار ہو جاؤ جاوید آنے والا ہے
امی عبداللہ سے کہیے کھانا پکا دے۔ ایمان سے بڑی
بھوک لگ رہی ہے۔ اس نے ماں کی بات سنی ان سنی کر دی۔

اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو
تیر رہے تھے۔ برگ گل پر شبنم کے موتی۔

دُودِ چراغِ گُل

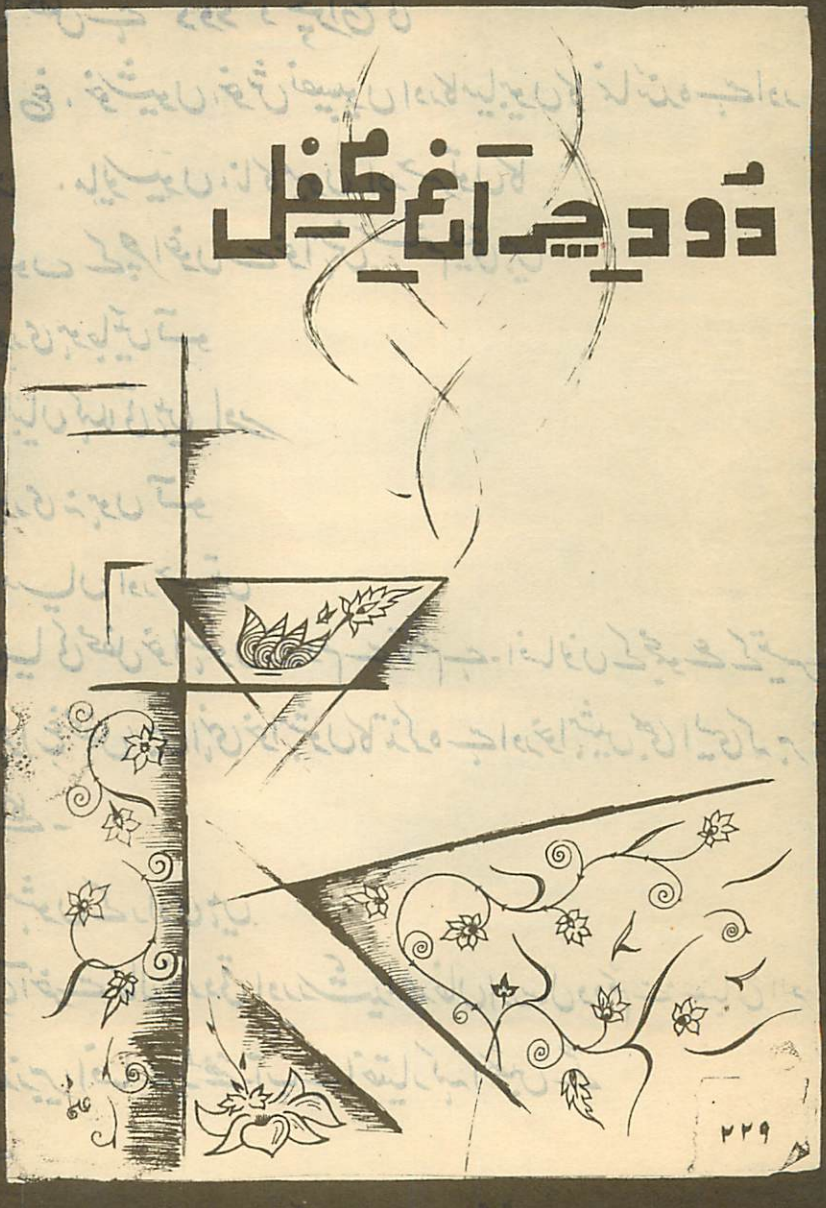

دُودِ چراغِ محفل

یہ دُنیا محفل ہے دُود و چراغ کی

چراغ، خوشیوں، خوش نصیبیوں اور کامیابیوں کا نمائندہ ہے اور

دود، مایوسیوں، ناکامیوں اور حسرتوں کا

خوشیوں کے چراغوں سے خواہش جنم لیتی ہیں

اگر پوری ہو جائیں تو

کامیابیاں کہلاتی ہیں اور

اگر پوری نہ ہوں تو

ناکامیاں اور حسرتیں

دُنیا کی محفل خواہشوں کے دم سے قائم ہے۔ افسانوں کے مجموعے کے تیسرے حصے "دودِ چراغِ محفل" میں انہی خواہشوں کا تذکرہ ہے اور خواہشیں بھی ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔

خواہشوں کے راوی ہیں۔

سالِ آخر سے خالد فاروقی اور رشید احمد خاں اور سال دوئم سے مصباح العزیز اور نعیم احمد زبیر، افسانے پڑھئے۔ آپ بے اختیار کہہ اٹھیں گے

یہ دھواں کہاں سے اُٹھتا ہے

مُدیرِ اعلیٰ

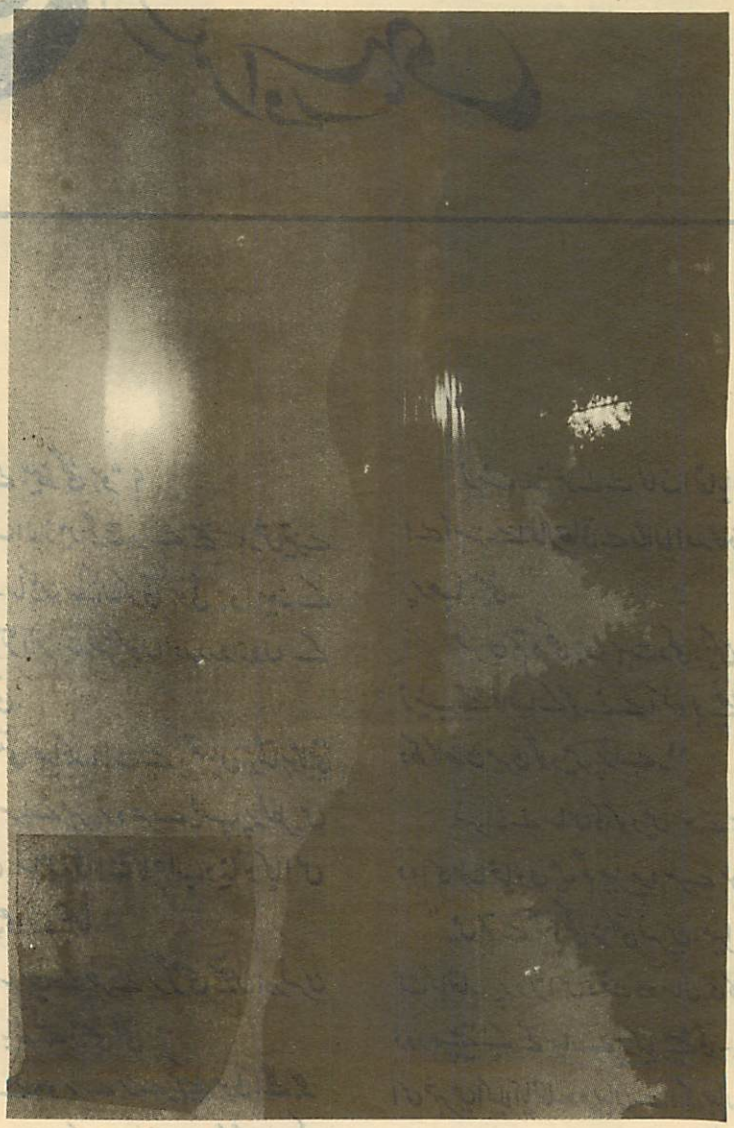

سفر اور سبھی

خالد فاروقی

"نسرین بیٹی اٹھ کے بیٹھ گئی ہو" ؟

بادل غضب ناک انداز میں گرج رہے تھے۔ بارش تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا مینہ کے بڑے بڑے چھینٹوں کو تڑاتڑ بند کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں پر پٹخ رہی تھی۔

"اُف میرے اللہ کتنی بھیانک رات ہے ! تمہیں ڈر لگتا ہوگا بیٹی"

نسرین پلنگ کے سرہانے میز پر دھرے لیمپ پر نظریں جمائے خاموش بیٹھی تھی۔ ساس کی بات کا جواب دینا تو کجا اس نے اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

زینب کی نظریں نسرین کے چہرے پر گڑی تھیں اور نسرین اسی طرح لیمپ پر ٹکٹکی باندھے بیٹھی تھی

زینب کی آنکھوں نے دو بڑے بڑے چمکیلے موتی اگلے جو آواز نکالے بغیر ٹوٹ گئے اور اس کے مرجھائے ہوئے گالوں کی گہری جھریوں میں بھٹکنے لگے۔ روشندان میں سے پہلے بجلی کی چمک اندر آئی پھر کہیں دور سے کڑک کی آواز سنائی دی۔ اوپر چھت پر مینہ نے اودھم مچا دیا۔

زینب نے ہولے سے لحاف اٹھایا۔ ننھے انور کا ماتھا چوما پھر اسے آہستہ سے اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا اور لحاف اٹھا کر نسرین کے پلنگ پر جا بیٹھی۔

نسرین تم دکھی ہو۔ بہت دکھی۔ لیکن تمہارا دکھ لا علاج نہیں"۔ زینب نے لحاف کے کونے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو تمہارے دکھ کا علاج میری گود میں پڑا ہے۔"

نسرین نے ساس کی گود میں سوئے ہوئے انور کو بھی نہ دیکھا وہ اسی طرح خیالوں میں گم میز پر دھرے ہوئے لیمپ کو گھورتی رہی۔

"میں تم سے کم دکھی نہ تھی نسرین۔ میرا سہاگ بھی عین دوپہر میں لٹ گیا تھا۔ پرویز اس وقت دو سال ہی کا ہوگا۔ لوگ کہتے تھے، دودھ پیتے بچے کے سہارے پر کیا بیٹھے گی۔ پرویز کا ابا کہیں دور سے اس شہر میں اکیلا آیا تھا۔ وہ یہاں سے اگلے جہاں کو سدھارا تو اس گھر میں سوائے میرے اور پرویز کے کوئی نہ تھا۔ میکے سے بھائی اور بھاوجیں آتی رہیں کہ مجھے کہیں اور ٹھکانے لگائیں۔ لیکن میں نے صاف کہہ دیا کہ میرا ٹھکانا تو ایک ہی ہے اور وہ یہ گھر ہے۔ میں نے دنیا والوں سے نبرد آزما ہونے کی ٹھان لی۔ کچھ عربی اردو کی شُد بُد تھی۔ کچھ سینے پرونے کا سلیقہ تھا

محلے کی لڑکیاں یہاں آنے لگیں اور میں بیٹے کے عزت کی روٹی کھانے لگی لوگ پیام لے کے آتے تو زبان سے کچھ نہ کہتی۔ پنگوڑے میں کھیلتے چہکتے پرویز کی طرف اشارہ کر دیتی کہ میرا بیٹا۔ میرا سب کچھ وہی ہے۔

ٹپ ۔۔۔۔ ٹپ ۔۔۔۔ ٹپ۔ نسرین نے لیمپ پر سے نظریں ہٹا کر میز کی سطح پر ڈالیں۔ جہاں گدلے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ چھت ٹپکنے لگی تھی۔

نسرین جلدی سے اٹھی۔ جیسے اسے ساس کی ناگوار باتوں سے بچنے کا موقع ہاتھ آگیا ہو۔ اس نے کونے سے بالٹی پکڑی اور میز کو پرے سرکا کر اسے فرش پر رکھ دیا۔ پھر پلنگ کے پاس کھڑی ہو گئی۔

زینب نے بازو آگے بڑھا کے نسرین کی کمر میں ڈال دیا اور اسے اپنے پاس پلنگ پر بٹھا لیا۔

"گرمیوں میں ایک رات ہم چھت پر سو رہے تھے کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ پرویز بڑے اطمینان سے سو رہا تھا۔ سہانی تاروں بھری رات تھی مگر پتہ نہیں کیوں چاندنی میری آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ میں نے سوچا لوگ کہتے ہیں۔ ہر کسی کے مقدر کا ایک ستارہ ہوتا ہے۔ کیوں نہ آج میں آسمان پر اپنے مقدر کا ستارہ ڈھونڈوں۔ خدا جانے کب تک اس سرے سے لے کر اس سرے تک ستاروں کو گھورتی رہی۔ کسی پر بھی مجھے اپنا نام لکھا نظر نہ آیا۔ کسی میں بھی مجھے اپنا عکس دکھائی نہ دیا۔ میری نظر اجنبی ستاروں کی بھیڑ میں ٹھوکریں کھا کھا کر تھک گئی اور آخر نڈھال ہو کر میرے پہلو میں آگری۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میرے مقدر کا ستارہ آسمان میں نہیں جڑا تھا۔ میری آغوش میں پڑا تھا۔"

زینب خاموش ہو گئی۔

نسرین بالٹی پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ جس میں گدلے پانی کے قطرے برابر گر رہے تھے۔ باہر پانی کے زور سے پرنالے اور نالیاں جیسے جاگ اٹھی تھیں۔

"دن۔ ماہ۔ سال۔ وقت گذرتا گیا۔ میرے بال کالے سے سفید ہو گئے میں اٹھتی بیٹھتی۔ گرتی پڑتی آگے بڑھتی گئی۔ سفر لمبا تھا۔ راہ دشوار تھی، لیکن میری آنکھیں اپنے ستارے پر گڑی تھیں۔ میں ایک لمحہ بھی اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ آخر دنیا والے ہارے اور میں جیت گئی۔ میرا پرویز جوان ہوا اور تمہیں بیاہ کر لایا۔ اب میرے گھر میں بیٹا بھی تھا اور بہو بھی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے سورج اور چاند اکٹھے ہو گئے ہیں۔ دیکھنے والوں کی نظریں چندھیا گئیں۔ مگر نسرین تم نے بھی نصیب میرے ہی پائے تھے۔ انور تین برس کا ہوا تو پرویز اپنے ابا سے جا ملا۔"

ٹپ ۔۔۔ ٹپ ۔۔۔ ٹپ گدلے پانی کے قطرے زینب کی آنکھوں سے لحاف پر گرے اور جذب ہو گئے۔

"مگر تم دل نہ چھوڑو۔ نسرین تمہاری قسمت کا ستارہ ڈوبا نہیں۔ چمک رہا ہے۔ اس پر نظریں جمائے چلتی جاؤ میری بیٹی۔" زینب روئے جا رہی تھی اور نسرین بالٹی پر آنکھیں گاڑے ہوئے تھی۔

"تم نے ہمیشہ غلط سمجھا نسرین۔ میں پرویز کو تم سے پرے نہ رکھتی۔ آخر میں اس کی ماں تھی۔ وہ مجھے پیارا تھا۔ بہت ہی پیارا۔ تمہیں لوگ الٹا سبق پڑھائیں گے تم ابھی میکے نہ جاؤ بیٹی۔۔۔ تم بولتی کیوں نہیں نسرین؟"

محلے کی لڑکیاں رومال قاعدے
پسارے ہاتھوں میں لئے حیران کھڑی
تھیں کچھ کمرے میں کچھ صحن میں

ساس نے بہو کے گلے میں بازو ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ "نسرین تو اس جلے گھر کی راکھ میں ایک چنگاری ہے۔ آؤ دونوں مل کر اسے بجھنے سے بچا لیں۔ آؤ نسرین انور کو پالیں۔ جوان کریں اور بیاہیں۔ میں نے اکیلی لڑائی جیتی تھی۔ بیٹی تم میری مدد سے ایسا کیوں نہیں کر سکتیں؟۔ بولو بیٹی تم چپ کیوں ہو؟۔ جانے مجھے تمہاری خاموشی سے کیوں ڈر لگ رہا ہے نسرین؟۔ ننھا تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

نسرین نے زبان کھولی ہی تھی کہ اچانک کمرے میں چکا چوند پیدا ہو گئی اور ایک خوفناک کڑک نے ان کے کان بند کر دیئے۔ یوں محسوس

ہوا جیسے بجلی ان کے صحن میں گری ہو۔

نسرین اور زینب سہم کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ ننھا انور بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور زور زور سے چیخنے لگا۔

پرویز کو مرے سات مہینے ہوگئے تھے اور نسرین کو میکے گئے دو ماہ ہونے کو آئے تھے۔ زینب کی مایوسی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ نسرین کے خط باقاعدہ آتے اور ننھے کے لئے لاڈ و پیار اور دعاؤں سے بھرے ہوتے

ان دنوں اگر ننھا انور زینب کے پاس نہ ہوتا اور محلے کی لڑکیاں معمول کے مطابق اس کے ہاں نہ آیا جایا کرتیں تو وہ ضرور پاگل ہو جاتی۔ اپنے مرحوم شوہر اور بیٹے کا جتنا غم اب اسے تھا پہلے کبھی نہ تھا۔ جس روز نسرین کا خط آتا وہ کھٹولی پر لیٹے انور کے ساتھ بیٹھ جاتی اور سارا خط اسے بلند آواز سے پڑھ کر سناتی پھر اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیتی اور اس کے گال اور ماتھا بار بار چومتی۔ پھر دیوانوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ اردگرد بیٹھی ہوئی قاعدے۔ پارے۔ رومال۔ سلائیاں سنبھالے لڑکیاں اپنی استانی کی عجیب وغریب حرکتوں پر حیران ہوتیں۔ پھر کتنی کتنی دیر وہ آئینے کے سامنے مبہوت کھڑی رہتی۔ جانے وہ اپنے ہلکے سانولے ڈھلکے ہوئے جھریوں والے چہرے اور سفید بالوں میں کیا ڈھونڈتی شاید وہ مستقبل کے مقابلے میں اپنی قوتوں کا جائزہ لیتی تھی۔ اور پھر ایک دن اسے نسرین کا خط ملا۔

"اچھی امی!"

ننھا مجھ سے زیادہ آپ سے پیار کرتا ہے۔ وہ میرے بغیر رہ سکتا ہے مگر آپ کے بغیر نہیں۔ مجھے ننھے سے محبت ہے اور آپ سے بھی۔ مگر میں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ مجھے ننھے سے بھی ڈر لگتا ہے اور تم سے بھی۔ میرے شوہر کا وہی حشر ہوا جو اس کے باپ کا۔ کہیں میں بھی وہی کچھ نہ دیکھوں جو آپ نے دیکھا ہے امی مجھے اس خوفناک چکر میں نہ پھنسائیے۔ اس طوفانی رات کو مجھے آپ سے کتنا خوف آرہا تھا۔ اف، رونا بھی تو میرے بس کی بات نہ تھی۔ کتنی بار میرے دل میں غم کا ابال آیا مگر آنسو نہ آسکے۔

نسرین زینب نہیں بننا چاہتی۔ اسے معاف کر دیں۔

آپ کی بیٹی

نسرین

"سن لیا۔ ننھے۔ یہ ہے تیری امی کا آخری خط میرے لال۔"

زینب نے انور کو پلنگڑی سے اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ اور اس کا منہ چومنے لگی۔ "اس بستی میں لوٹ مچی ہے ننھے۔ تیرا ابا خدا نے چھین لیا۔ تیری امی کو دنیا نے۔ لیکن میں ہتھیار نہیں ڈالوں گی میرے لال۔ میں لڑوں گی۔ تو جیئے گا۔ جوان ہوگا۔ وہ صحن سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ اور انور کا گال اپنے گال سے لگا کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان امڈ رہا تھا۔

"اماں۔۔۔ اماں۔۔۔" ننھے انور نے رال بھرے منہ سے ننھی سی انگلی نکال کر آئینے کی طرف اٹھائی۔ جس میں اسے زینب کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ "میں بوڑھی ہوں تو کیا۔ راہ کٹھن ہے تو کیا۔ میں تیرے سہارے چلوں گی میرے بیٹے۔۔۔ اک سفر اور سہی میرے لال۔ محلے کی لڑکیاں رومال قاعدے، سپارے ہاتھوں میں لئے حیران کھڑی تھیں کچھ کمرے میں کچھ صحن میں۔

مساوات

ایک چیونٹی نے ہاتھی سے کہا:۔ "دیکھئے ہاتھی صاحب، یہ زمانہ مساوات کا زمانہ ہے آپ کو بھی اسی قدر کھانا چاہئے جس قدر میں کھاتی ہوں۔"

ہاتھی نے کہا:۔ "محترمہ! یقین کیجیے میں بھی مساوات پر یقین رکھتا ہوں اور میرا خیال بھی یہی ہے کہ جس قدر میں کھاتا ہوں اسی قدر آپ کو بھی کھانا چاہئے۔"

زندگی کے ان پیچیدہ راستوں میں نہ جانے کتنے لوگ ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی یاد زندگی بھر کانٹا بن کر چبھتی رہتی ہے۔ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں ان کانٹوں سے چھٹکارا پانا ممکن نظر نہیں آتا۔ ایک چنگاری سی سلگتی رہتی ہے۔ اور جب کبھی تنہائی میں اس چنگاری کو کریدیں تو آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ بھی اس وقت اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جل رہا تھا۔ اس کی اپنی ہی لگائی ہوئی تو تھی۔ اس میں بھلا شازیہ کا کیا قصور ـــــ اسی نے تو ـــــ

"عمران ـــــ"

"جی ـــــ" وہ بھائی جان کی آواز پر چونک پڑا ـ

اعلان ہو رہا ہے کہ مسافر جہاز پر پہنچ جائیں۔

"جی اچھا ـــــ"

اس نے ننھے عامر کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"بھابی ـــــ عامر مجھے بیٹوں کی طرح عزیز ہے۔ اس کی آواز بھرا گئی ـــــ"

نئی نویلی دلہن نے مہندی لگے ہاتھوں سے عامر کو اس کی گود سے لے لیا۔

"بھیا آپ فکر نہ کریں۔ عامر زندگی بھر ماں کی کمی محسوس نہیں کریگا۔"

"ڈیڈی ـــــ خدا حافظ ـــــ" عمران کے دو آنسو ڈیڈی کے کوٹ میں جذب ہو گئے۔

"خدا حافظ بھائی جان ـــــ"

"خدا حافظ عمران ـــــ"

وہ تیزی سے مڑا ـــــ اور مسافروں کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

جہاز آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ اس کے ہلکے شور میں سے آواز نکلی ـ

"بھیا آپ فکر نہ کریں۔ عامر زندگی بھر ماں کی کمی محسوس نہیں کریگا۔"

"بھیا آپ فکر نہ کریں ـــ بھیا آپ فکر نہ کریں۔ بھیا۔ بھیا۔ بھیا۔ بھیا"

کوئی اس کے کانوں میں چیخنے لگا۔

"آپ کافی پسند کریں گے یا چائے؟"

وہ ایئر ہوسٹس کی آواز پر چونک پڑا۔

"جی۔ کافی" ـــــ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"آپ چائے پئیں گے یا کافی" شازیہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجی، ماضی کے ہلکے ہلکے نقوش ابھرنے لگے۔

"جی ـــــ کافی" بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

"لیکن ـــــ آپ یہ تکلیف کیوں کر رہی ہیں۔ آپ تو ابھی مہمان ہیں۔"

کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اب مہمان نہیں ہوں۔ اب تو زندگی کا ایک حصہ یہیں گذارنا ہے" شازیہ کمرے کو معطر چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔

شازیہ ـــــ وہ آنکھیں بند کر کے کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

شازیہ اس کی بھابی کی چھوٹی بہن تھی۔ اس سال وہ ایم بی بی ایس سال اوّل میں داخلہ لے کر عمران کے کالج آئی تھی۔ عمران کا یہ دوسرا سال تھا۔ شازیہ کا گھر چونکہ شہر سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر تھا اس لئے وہ ان ہی کے گھر شفٹ ہو گئی تھی۔ اس کو آئے ہوئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے۔ لیکن ان ہی دنوں میں وہ عمران کے کتنے قریب آ گئی تھی۔ وہ اپنے دل کو ٹٹولنے لگا۔

"آخر اس لڑکی میں کیا خاص بات ہے؟ چند ہی دنوں میں یہ میری سوچ کا مرکز کیوں بن گئی ہے؟" اس میں کوئی خاص خوبی تو نہیں۔

خوبصورت بھی نہیں کہا جا سکتا۔ رنگ سانولا سا ـــــ ہونٹ پتلے تو نہیں ہیں، لیکن موٹے بھی نہیں ـــــ آنکھیں بڑی بڑی جھیل سی۔ بال تو خیر لمبے اور سیاہ ہیں۔ جسم صحت مند ہے۔ خیر بُری بھی تو نہیں۔ مجموعی طور پہ اچھی لگتی ہے۔ ہاں ایک بات ہے بولنے کا انداز بہت پیارا ہے۔ جیسے خاموش پرسکون ماحول میں دور کہیں عبادت گاہ میں گھنٹیاں سی بج رہی ہوں۔"

"کیا سوچ رہے ہیں آپ" ـــــ خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ شازیہ کافی لئے کھڑی تھی۔

"جی ـــــ جی کچھ بھی تو نہیں ـــــ بس ایسے ہی سوچ رہا تھا کہ کل کون کون سی کلاسیں ہیں" عمران نے صاف جھوٹ بول دیا۔

"ہماری کلاسیں کب سے شروع ہو رہی ہیں"؟ شازیہ شاید باتوں کے موڈ میں تھی۔

"سنا ہے اس سوموار سے شروع ہو رہی ہیں" عمران نے کافی کا گھونٹ اتارتے ہوئے کہا۔

"کتابیں وغیرہ کون کون سی خریدنا پڑیں گی"

"ارے ان کا فکر نہ کریں۔ میرے پاس پورا سیٹ پڑا ہے بس آپ کو جرنل خریدنا پڑیں گے"

"اور ہاں آپ اتنی رات گئے جاگ رہی ہیں"

بس نیند نہیں آ رہی تھی۔ آپ کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ سوچا آپ اسٹڈی کر رہے ہوں گے۔ آپ کو چائے وائے بنا کر دے آؤں۔ کچھ وقت بھی کٹ جائے گا اور پھر شاید نیند بھی آ جائے شازیہ ناخن سے میز کا پالش کھرید رہی تھی۔

"بہت بہت شکریہ ـــــ آپ کو میرا بہت خیال رہتا ہے"!

"ایک ہی منزل کے راہی جو ہوئے" ـــــ شازیہ نے کہا۔

"جی کیا مطلب" ـــــ عمران کو جیسے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا ہو۔

"میرا مطلب ہے ہمارا ایک ہی پروفیشن ہے اور ایک ہی کالج میں زندگی کا ایک حصہ اکٹھے گذارنا ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے کا خیال نہیں رکھیں گے تو کیسے گذارا ہو گا"۔ شازیہ نے تشریح کر دی۔

بس زندگی کا ایک حصہ ہی اکٹھے گذارنا ہے! - یا .....

"جی ـــــ" شازیہ کچھ سٹ پٹا گئی ـــــ

"میرا مطلب ہے کیوں نہ ہم گریجویشن کے بعد بھی ....."

زندگی کے یہ اہم فیصلے اتنی جلدی نہیں کئے جا سکتے عمران صاحب شازیہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ـــــ ویسے میں سمجھتی ہوں وہ لڑکی خوش قسمت ہو گی جو آپ کی شریک حیات ہو گی۔

کلاک کی سوئیاں تیزی سے گھومتی رہیں۔ وقت کا بوڑھا ہاتھ زمانے کے اوراق پلٹتا رہا۔ شازیہ اور عمران محبت کے انجانے راستوں پر چلتے رہے۔ اور یوں پلک جھپکتے میں تین سال کا عرصہ گذر گیا۔ کبھی کبھی شام کو وہ گھومنے کے لئے نکلتے تو نہ جانے مستقبل کے کتنے منصوبے بنا ڈالتے۔

کبھی کبھی شازیہ ہنستے ہنستے اچانک سنجیدہ سی ہو جاتی۔ اور دور خلاؤں میں کچھ ڈھونڈنے لگتی

"بھئی کیا فضولیات سوچنے لگتی ہو ـــــ"

"نہیں عمران ـــــ قہقہے اور اتنی ڈھیر ساری خوشیاں سب ہی لوگوں کو راس نہیں آتیں ـــــ"

"ارے چھوڑو اس فلسفے کو۔ اب میرے اور تمہارے درمیان فاصلہ ہی کتنا رہ گیا ہے، یہ میرا فائنل ایئر ہے۔ اگلے سال تم بھی ڈاکٹر بن جاؤ گی ـــــ اور پھر ـــــ"

"پھر ہم ایک ہو جائیں گے ـــــ"

"انشاء اللہ کہو عمران ـــــ" شازیہ نے جیسے بھیک مانگی ہو۔

"—— سچ

پوچھو تو عامر بیٹے کی توتلی باتیں سن کر بعض اوقات جی مچل جاتا ہے۔ کہ ایک ایسا کھلونا ہمارے پاس بھی ہو ——"

"عامر بھی تو آپ ہی کا بیٹا ہے۔ —— بھتیجے اور بیٹے میں فرق ہی کیا ہوتا ہے"۔ شازیہ اس کی ٹائی سے کھیل رہی تھی۔ "کچھ عرصہ کے بعد عامر کو بھی اپنا ساتھی مل جائے گا۔"

اور پھر وہ دن بھی آیا —— اور قیامت بن کر گذر گیا۔ ایک نئی روح چند لمحوں کے لئے دنیا میں آئی اور ایک روح کو لے کر واپس چلی گئی۔ گھر بھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ بھائی جان کبھی نیم دیوانگی کے عالم میں عامر کو بے تحاشہ پیار کرنے لگتے۔ اور کبھی بھابی کے بے جان چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگتے۔ جیسے انہیں نیند سے بیدار کر رہے ہوں ——

عامر سہم کر شازیہ کی گود میں چھپا بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ امی اتنی دیر سے کیوں سو رہی ہیں؟ اور اتنے سارے لوگ جمع کیوں ہو گئے ہیں؟ ——

وقت چیونٹی کی طرح رینگتا ہوا گذرتا گیا۔ اس سوگوار ماحول میں ہی عمران نے امتحان دیا۔ ابھی عمران پر پہلے صدمے کا اثر ختم نہ ہوا تھا کہ قسمت نے ایک اور چوٹ لگائی —— وہ اپنا آخری پریکٹیکل دے کر واپس آیا تھا۔ اسے پتہ چلا کہ شازیہ کے ابو امی آئے ہوئے ہیں۔ وہ سیدھا ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ آداب کیا اور

عمران کو اپنی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی

صوفے پر بیٹھ گیا۔

ڈیڈی ان سے کہہ رہے تھے۔

"ان حالات میں مجھے یہی ایک صورت نظر آتی ہے۔ عامر بیٹے کا مستقبل بھی محفوظ رہے گا، اور میرے بیٹے کا زخم بھی دھل جائے گا۔ آپ لوگوں کا فیصلہ دونوں باپ بیٹوں کی زندگی سنوار دے گا —— ورنہ۔

"نہیں نہیں رحمان صاحب" شازیہ کے ابو نے بات کاٹتے ہوئے کہا! "مجھے بھلا کیا انکار ہو سکتا ہے۔ قدرت کو جو منظور تھا وہ ہو گیا۔ وہ بیٹی بھی آپ کی تھی، اور یہ بیٹی بھی آپ کی ہے۔ جب جی چاہے اسے بہو بنالو ——"

"میں آپ لوگوں کا احسان عمر بھر نہیں بھول سکتا ——"

عمران کو معلوم نہیں کب وہ وہاں سے اٹھا اور کب اپنے کمرے میں پہنچا —— دروازے میں شازیہ کھڑی تھی ——"

"شازیہ —— یہ —— یہ سب —— کیا ہو رہا ہے؟"

عمران کو اپنی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"شازیہ تو جیسے پتھرا گئی تھی ——"

"شازیہ —— بولو شازیہ —— کہہ دو کہ یہ سب جھوٹ ہے"۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا شازیہ —— کبھی نہیں ——"

اس نے شازیہ کو جھنجھوڑ ڈالا ——

"عامر کو میرے سوا ماں کا پیار اور کون دے سکتا ہے عمران"

شازیہ کی جھیل سی آنکھیں چھلک پڑیں ——

"شازیہ —— لیکن —— لیکن —— میری زندگی ——"

"عامر بھی تو آپ ہی کا بیٹا ہے —— کیا آپ کو عامر کی زندگی اور اس کا مستقبل عزیز نہیں ——"

شازیہ کی آنکھیں جیسے ساون کی بدلیاں بن کر برسنے لگیں۔

"شازیہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا ——"

تم —— شازیہ —— تم —— چلی جاؤ —— یہاں سے

وہ بستر پر گر پڑا ——

"یور اٹینشن پلیز" ——

اسپیکر پر جہاز کے کپتان کی آواز سن کر وہ چونک پڑا ——

"ہم لندن کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔ براہ مہربانی اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لیں ——

اور وہ جلدی جلدی سیٹ بیلٹ باندھنے لگا۔

مصباح العزیز

گیلی لکڑی

"بڑھیا مر گئی"، "بڑھیا مر گئی"، جیسے ہی میں گھر میں داخل ہوا میں نے یہ لفظ سنے۔

"ارے کیا شور مچا رکھا ہے؟" میں نے بچوں کو ڈانٹا۔"

انو آگے بڑھا اور بولا، "بھائی جان بڑھیا مر گئی۔"

"کون سی بڑھیا" میں نے لاتعلقی سے پوچھا۔"

"بھیا وہ نال کے پاس رہتی تھی نا" منو نے اپنی توتلی زبان میں کہا۔

"ہوں" انو نے اسے گھور کر دیکھا، پھر وہ اپنی بڑھائی جتاتے ہوئے بولا۔ "بھیا اسے کیا معلوم میں آپ کو بتاتا ہوں۔ وہ کالے خاں کا لکڑیوں کا ٹال ہے نا اس کے پاس"۔۔۔۔ انو آگے نہ جانے کیا کیا بولتا رہا لیکن میرے ذہن میں بوڑھی چندا کی تصویر ابھری جو ایک بے جان لاشے کی مانند گزشتہ کئی سال سے کالے خاں کے ٹال کے باہر ایک ٹوٹی پھوٹی کھٹولی پر پڑی رہتی تھی۔ مجھے ٹھیک طرح سے تو یاد نہیں کہ چندا کو میں نے پہلی بار کب دیکھا تھا، لیکن آخری بار میں جب میں ان سے ملا تھا تو اس کے متعلق میں بہت کچھ جانتا تھا، ننھے انور نے مجھے یہ خبر سنائی تو میں سکتے میں آگیا، میرے ذہن کے پردے پر ایک فلم سی چلنے لگی۔

وہ گرمیوں کی تپتی ہوئی ایک دوپہر تھی جب میں نے پہلی بار اس کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت محسوس کی تھی، اس دفعہ گرمی کچھ شدت سے پڑ رہی تھی۔ میں گھر آیا تو اماں نے مجھے برف لینے کے لئے بھیج دیا، واپس آتے ہوئے نظر بڑھیا پر پڑی، بڑھیا کالے خاں کے ٹال کے باہر اپنی کھٹولی پڑی تھی، اس دن میں نے اسے پہلی بار نہیں دیکھا تھا لیکن نہ جانے اس پر بہت ترس آ رہا تھا، پہلے تو فٹ پاتھ پر دکھائی دیتی تھی لیکن کسی خدا ترس آدمی نے اسے چارپائی لا دی اور پھر اس کا ڈیرہ اس پر جم گیا۔ چارپائی کے ٹھیک بیچ میں بڑا سا جھول پڑ گیا تھا۔ بڑھیا اس میں پڑی رہتی تھی، ارد گرد مکھیاں بھنبھناتی رہتیں، پاس ہی ایک کٹورا تھا جس کے سارے کنارے ٹوٹے ہوئے تھے، دوپہر اور شام کو کالے خاں اپنا بچا کچھا کھانا لا دیا کرتا تھا، بڑھیا کے ساتھ شاید پیٹ نہیں تھا کہ روٹی کھانے کے بجائے صرف سونگھا کرتی تھی۔

اس کے پاس روٹی کے بچے کھچے روٹی کے ٹکڑے پڑے رہتے، کبھی کوئی کتے کا پلا آ کر انہیں لے جاتا اور کبھی بلی کا بچہ اس سے اپنا پیٹ بھر لیتا اسے بھیک مانگتے کسی نے دیکھا تھا، اور بھیک مانگنے کی ضرورت کیا تھی کھانا اسے مل جاتا تھا اور بس۔ بڑھیا دیکھنے میں مخبوط الحواس نظر آتی تھی مگر باتیں ہوش کی کرتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے اور وہ گھنٹوں کچھ نہ کچھ بڑبڑاتی رہتی، کٹورا اس نے ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا اور اس کے پیندے میں تھوڑا سا پانی تھا، مجھ سے رہا نہ گیا،

دل کے گوشے میں چھپے ہوئے ہمدردانہ جذبات عود کر آئے اور میں پوچھ ہی بیٹھا۔ "اماں برف کا پانی پیو گی؟"

کچھ جواب نہیں ملا، میں نے پھر پوچھا "اماں برف کا پانی پیو گی؟"

اس دفعہ لبوں کو جنبش ہوئی، "لا بیٹا اللہ تجھے خوش رکھے۔"

بڑھیا ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گئی۔

"اماں جی اور پانی دوں؟" میں نے پوچھا۔ لب ہلے مگر مخاطب میں نہیں تھا۔ بڑھیا دور فضاؤں میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی، آنکھیں

ٹک ٹک ایک طرف جمی تھیں۔

"نورے تجھ سے کتنی بار کہا ہے کہ اتنی گرمی میں باہر نہ جایا کر۔ لیکن تو مانتا ہی نہیں۔ دیکھ وہ ہنڈیا میں تیرے لئے کھانا رکھا ہے جب تک تو وہ کھا میں تیرے لئے لسی بناتی ہوں۔ نورے! نورے بیٹا ادھر آ کہاں چلا گیا ہے۔ نورے اب تو رات ہو گئی ہے اب تو آجا"!!

اور نہ جانے بڑھیا کیا کیا بولتی رہی، کالے خاں نے مجھے بتایا کہ بڑھیا کو اکثر ایسے دورے پڑتے رہتے ہیں، اب یہ دن بھر خلاؤں میں تکتی رہے گی، اور "نورے نورے" پکارے گی۔

اب تو جیسے میرا معمول بن گیا تھا۔ جب بھی میں ادھر سے گزرتا اس کا حال احوال پوچھتا اور وہ بھی مجھ سے کافی مانوس ہو گئی تھی ایک روز شام کو میں نے اسے روٹی لا کر دی اور واپسی پر جا ہی رہا تھا کہ مکئی والا آ گیا "اماں جی مکئی کھاؤ گی"، میں نے ایسے ہی پوچھا۔

بے چاری کے منہ میں دانت ہی کہاں تھے کہ مکئی سے زور آزمائی کرتی، وہ کچھ نہ بولی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر بولی "نورا بھی جب کھیت سے آتا تھا تو میرے لئے مکئی لاتا تھا"۔

"میں سمجھا کہ پھر دورہ پڑ گیا ہے۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ وہ بولی بیٹھ جاؤ بیٹے"۔

اسے حواس میں دیکھا تو پھر پوچھ ہی لیا "اماں جی یہ نورا کون ہے"؟

اماں نے ایک لمبی سانس اور چارپائی سے ایک میلی کچیلی چندی نکالی اور اس سے اپنی کیچڑ بھری آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے بولی "بیٹھ جا بیٹے آج تجھے اپنی کہانی سناؤں"۔

"ہاں اماں سناؤ" اور پھر میں وہیں چارپائی پر پوٹلی کو ایک طرف بیٹھ گیا۔

"۳۰ برس پہلے بھی کیا دن ہوا کرتے تھے جب میں اپنے باپو کے ساتھ رہتی تھی ہمارا چھوٹا سا گھر تھا، باپو صبح فجر سے پہلے اٹھتا، میں اس کو ناشتہ دیتی اور ایک پوٹلی میں دوپہر کا کھانا باندھ دیتی، باپو جلدی جلدی ناشتہ کرتا اور پھر چلتے چلتے کہتا "دیکھ چندا جانوروں کو چارہ اچھی طرح دے دینا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ باپو چلا جاتا اور پھر میں جانوروں کو چارہ دیتی، خود ناشتہ کرتی اور صفائی میں لگ جاتی، اس گھر کی صفائی ہمیشہ میں نے کی تھی، جب میں چھوٹی سی تھی اور تتلا تتلا کر بولا کرتی تھی اور گھٹنوں کے بل چلا کرتی تھی۔ اس وقت واقعی چندا تھی۔ اب تو چاند میں بیٹھی بڑھیا بھی مجھ سے بھلی ہو گی۔ گاؤں میں ہیضہ کیا پھیلا جاتے جاتے میری اماں اور چھوٹے بھیا انور کو بھی اپنے ساتھ لے گیا، باپو جب مجھے یہ سناتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ میں ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتی، لیکن وہ پھر دن بھر اداس رہتا، میں صفائی کر کے پانی بھرنے چلی جاتی، کنویں پر سب لڑکیاں بالیاں جمع ہوتیں ایک دوسرے پر پانی اچھالتیں اور کبھی ایک دوسری کے پیچھے بھاگتیں ایسے ہی دن گزرتے رہے، میں نے فکر دیکھے تھے نہ کبھی غم ہی ہر وقت خوش رہتی ایک روز میں پانی بھر کر لوٹی، دیکھا کہ باپو صحن میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ زور زور سے سانسیں چل رہی تھیں، ساتھ ساتھ کھانسنا بھی جاتا تھا۔ "باپو" میں چیخی "باپو تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے آج تم جلدی کیسے آ گئے ہو"؟

باپو کھانسا "ٹھیک ہوں چندا ذرا سا چکر آ گیا تھا۔ میں نے سوچا تھوڑا سا آرام کر لوں تو پریشان نہ ہو۔ جا اپنا کام کر۔ ابھی ٹھیک ہو جاتا ہوں"۔

باپو ٹھیک نہیں ہوا۔ وہ اس دن چارپائی پر لیٹا اور پھر اٹھ نہیں سکا۔

ویرجی ایک روز باپو سے کچھ بولے میں سن نہ سکی اور پھر شام کو چودھری فضل الدین کا باپ بھی آیا۔ دونوں کچھ باتیں کرتے رہے اور پھر فضل الدین کا باپ خوش خوش گھر چلا گیا۔

باپو نے مجھے بلایا "بیٹھ جا چندا میرے پاس اس طرف کو"۔

باپو نہ جانے کیا کیا نصیحتیں کرتا رہا۔ اب تو مجھے یاد نہیں پڑتا۔ بس اتنا یاد ہے کہ دوسرے دن فضل الدین بارات لے کر آ گیا اور میں سادہ کپڑوں میں دلہن بن کر باپو کے گھر سے رخصت ہو گئی، فضل الدین سے جب میری شادی ہوئی تو وہ ۳۰ برس کا ہو گا، اس کا ایک چھوٹا بچہ بھی تھا۔ بچے کی ماں دو برس پہلے زچگی میں مر گئی تھی۔ فضل الدین دو سال تک تو دیوانہ بنا رہا، کیونکہ اسے مرنے والی سے بڑی محبت تھی اور پھر لوگوں کے سمجھانے پر مجھے بیاہ لایا تھا۔ شادی کے روز مجھ سے بولا "چندا دیکھو

سے تم ... ہے۔ نو ... سے خوش رکھ ۔ سمجھ لیناکہ مجھے خوش ہوا ہے۔" پھر دن گزرتے گئے،

فضل الدین خوش تھا۔ مجھ سے کہتا چندا میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ مرنے والی کے بعد نورے کو تجھ جیسی ماں ملی ہے۔

نورا بڑھتا گیا، جب اس نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا تو میں نے پاس پڑوس میں مٹھائی بانٹی، سارے لوگ یہی کہتے کہ اگر نورے کی ماں بھی ہوتی تو اتنا پیار نہ کرتی۔

اور پھر جب نورا بیمار ہوا تو میں نے دن رات ایک کر دیئے۔ ساری ساری رات اس کے سرہانے بیٹھی رہتی اور ساری رات دعائیں مانگا کرتی۔ نہ جانے کس طرح گاؤں گاؤں پھر کر اس کے لیے لقمہ لائی تب کہیں جا کر نورے کا بخار ٹوٹا۔ اس دن میں کتنی خوش تھی، سال گزرتے رہے نورا بڑھتا رہا اور ہمارا پیار بھی بڑھتا رہا۔ اور جب فضل الدین مرا تھا تو میں کتنا پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ اس وقت نورے نے ہی مجھے تسلی دی اور کہا تھا نہ رو ماں نہ رو ابھی تیرا نورا زندہ ہے تو کس بات کا غم کرتی ہے۔

پھر میں سارا غم بھول کر نورے کا خیال رکھنے لگی، میں خود زیادہ کام کرتی تاکہ نورے کو زیادہ محنت نہ کرنی پڑے۔

نورا ماشاءاللہ کڑیل جوان تھا، اب مجھے اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ کرم الدین کی لڑکی سے اندر ہی اندر بات پکی کر لی اور کرم دین کی بیوی کو زبان دے دی کہ اس کی لڑکی شادی نورے سے کروں گی، وہ لڑکی مجھے بہت بھاتی تھی۔ خوبصورت، خوب سیرت اور نیک اور جب میں نے یہ ذکر نورے سے کیا تو وہ کتنا خوش تھا۔ اور مجھ سے کہنے لگا "ماں جی تم نے جو فیصلہ کیا ہے مجھے دل و جان سے منظور ہے۔"

اور پھر وہ خوش خوش کام پہ چلا گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد ہمارے گھر میں نئی نویلی دلہن آئی۔ نورا تو بس اپنی بیوی پر قربان ہوا جاتا تھا، پہلے تو صبح کا گیا بلاتے بلاتے دوپہر کو لوٹتا۔ اب تو جیسے اسے کوئی کام ہی نہیں رہ گیا تھا، تھوڑی دیر کے لئے کام پر جاتا اور پھر آ کر بیوی کے کام میں ہاتھ بٹاتا رہتا۔ مجھے تو اس نے کام کو ہاتھ لگانے کو منع کر دیا تھا۔ ایک دن نورا میرے پاس آیا اور بولا ماں جی کچھ سنا ہے، ... سال بارش بالکل نہیں ہوگی۔

اور واقعی اس سال بارش نہیں ہوئی، حالات جیسے بھی تھے گزر جاتے مگر اس ماہ بہو کے بچہ پیدا ہوا۔ زچگی میں بہو کی حالت بگڑ گئی تھوڑا بہت زیور پیسہ جو بچا رکھا تھا اس کے علاج پر صرف کر دیا، سر پہ قرضہ بھی چڑھ گیا۔ زچہ و بچہ کی جان پھر بھی نہ بچ سکی۔ نورا اس صدمے سے بے حال ہو گیا، نہ کام پر جاتا نہ کمرے سے نکلتا، بس خاموش پڑا رہتا ایک دن مجھ سے کہنے لگا۔ "ماں جی اب ہمارے حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ شہر چلا جاؤں، وہاں سے کچھ کما کر لاؤں تاکہ قرضہ تو اتر جائے۔"

میں نے بہت منع کیا اور روکا، لیکن وہ تو کسی کی سنتا ہی نہیں تھا آخر وہ ایک دن شہر چلا گیا اور ایسا گیا کہ سال گزرا پھر دو سال، لیکن نورے کی کوئی خبر نہ آئی، میں نے جانے کتنے لوگوں کو بھیجا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

ہاں بابو آج کل لکڑیاں
بہت گیلی آ رہی ہیں
دھواں بہت دیتی
ہیں

آخر میں آنکھوں میں آنسو لیے ہوئے خود اپنے نورے کو تلاش کرنے نکل کھڑی ہوئی۔ نہ جانے میں کتنے عرصے تک ماری ماری پھری ہر جگہ مجھے جھڑکیاں ہی سننا پڑیں، ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ چل دیتی، اب تک کچھ پتہ نہ چل سکا تھا۔ آخر ایک دن فضل دین کا ایک دور کا رشتہ دار مل گیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے نورے کو فلاں گاؤں میں کچھ روز پہلے دیکھا تھا کسی ہوٹل میں کام کرتا تھا۔ میں سب کچھ چھوڑ بھاگم بھاگ اس جگہ پہنچی وہاں ... کا پتہ معلوم کیا، جب منزل پہ پہنچی اور ہوٹل والے سے نورے ... پوچھا تو اس کمبخت نے بڑی حقارت سے دیکھا اور کہا جاؤ

جاؤ تمہارے بیٹے نے میرے یہاں چوری کی تھی۔ اس لئے میں نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔"

میرے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ نورا اور چوری، میں تو ایسا سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ نورا جسے میں نے خون پسینہ ایک کر کے تربیت دی تھی۔ چور تھا۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن مجھے اور لوگوں نے بتایا کہ نورے نے ہوٹل میں کئی مرتبہ چوری کی تھی لیکن ہر مرتبہ اسے معاف کر دیا تھا، یہ اس کی عادت بھی ہو گئی تھی۔ آخری بار جب چوری کی تو مالک نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا، میں گرتی پڑتی تھانے پہنچی، لیکن معلوم ہوا کہ نورا وہاں نہیں تھا۔ پھر کسی نے بتایا کہ نورا کسی پولیس والے کو چاقو مار کر بھاگ گیا ہے، میری حالت پاگلوں کی سی ہو گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں، کہاں جاؤں، جس طرف مجھے کوئی بتاتا اسی طرف چل دیتی اور جب تک مجھ میں طاقت تھی اسے تلاش کرتی رہی، اور جب ہاتھ پاؤں جواب دے گئے تو ادھر پڑ گئی اور ہر راہ گزرنے والے کو دیکھتی ہوں شاید کوئی نورا نکل آئے، اب تو نورا بالکل بدل گیا ہو گا۔

بات یہاں ختم ہو گئی لیکن بڑھیا بولتی رہی۔ "نورے، نورے دیکھ بیٹا اب تو رات ہو گئی ہے اب تو گھر آجا، نورے میرے پاس آجا تجھے کب سے تلاش کر رہی ہوں۔

میں وہاں سے اٹھ گیا، گھر آیا تو گھر کی گہما گہمی میں سب کچھ دھیان سے نکل گیا۔ پھر میں شہر سے باہر چلا گیا اور مجھے کئی روز تک بڑھیا سے ملنے کا موقع نہ مل سکا، اور جب میں واپس آیا تو گھر میں گھستے ہی سب سے پہلے یہ الفاظ سنے "بڑھیا مر گئی، بڑھیا مر گئی"، میں سامان رکھ کر کالے خاں کے ٹال کی طرف گیا۔ وہاں فٹ پاتھ پر چارپائی اسی جگہ پڑی تھی اور میلے کچیلے کپڑے اس پر پڑے تھے، مگر بڑھیا نہیں تھی ایک روٹی کے ٹکڑے پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، ایک طرف ٹوٹا ہوا کٹورا پڑا تھا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے کنارے اس بات کے منتظر تھے، وہی لب انہیں چھوئیں۔ لیکن اب وہ کانپتے ہوئے ہونٹ ساکت ہو چکے تھے اور وہ پیاس بجھ چکی تھی، جو برسوں سے یہ بجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی بڑھیا مر گئی ہے!

کالے خاں نے مجھے بتایا "صاحب بڑھیا مر گئی"

"اسے کیا ہوا تھا؟"

"صاحب ایک دن وہ بیٹھی ہوئی تھی کہ ایک نوجوان آیا۔ دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔ بڑھیا کو دیکھ کر رک گیا۔ وہ بڑی دیر تک کھڑا رہا۔ آخر وہ بڑھیا کی طرف بڑھا اور پکارا۔ "ماں" بڑھیا چیخی نورے تو کہاں چلا گیا تھا۔ لیکن تو آیا کب ہے۔ تو میرا نورا نہیں ہے، میرا نورا تو تجھ جیسا نہیں تھا۔ وہ چور نہیں تھا۔ اس نے کسی کو چاقو نہیں مارا تھا۔ تو نورا نہیں"، وہ پھر پکارنے لگی "نورے دیکھ تجھے کتنی دیر سے بلا رہی ہوں۔ اب تو آجا نورے رات ہو گئی ہے۔ نورے دیکھ تجھے کتنی بار بولا ہے کہ میرے پاس آجا، ادھر آجا۔ بڑھیا کے ہونٹ ہلتے رہے اور وہ دور فضاؤں میں تکتی رہی اور جلد ہی وہ نورے کے بازوؤں میں جھول گئی۔ "ماں۔ ماں"، نورا چیخا، لیکن بوڑھے ہونٹوں کو مزید جنبش نہ ہوئی۔ ہونٹ پھر نہ کانپے وہ چیز جسے بوڑھی آنکھیں برسوں سے تلاش کر رہی تھیں اسے مل گئی اس کی تھکی ہوئی آنکھوں کو پلکوں نے ڈھانپ لیا۔ نورا چیختا رہا دھاڑیں مارتا رہا اس کی آنکھیں آنسو برساتی رہیں۔ لیکن وہ بوڑھے ہونٹ پھر نہ ہلے، پھر وہ آواز نہ آئی "نورے گھر آجا رات ہو گئی ہے"۔ پھر ہم سب نے نورے کو دلاسہ دیا اور کفن دفن کا انتظام کر کے بڑھیا کو دفنا دیا۔ نورا کل تک تو رہا پھر بڑھیا کی پوٹلی لے کر روتا ہوا چلا گیا۔

کالے خاں چپ ہو گیا۔ ماحول پر بالکل سکوت طاری تھا، مجھے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ کالے خاں میری طرف دیکھتا گیا۔ مجھ سے کچھ نہ کہا گیا۔

آخر میں نے سکوت توڑا۔ "کالے خاں یہ لکڑیاں بڑا دھواں دے رہی ہیں"

"ہاں بابو آج کل لکڑیاں بہت گیلی آ رہی ہیں۔ دھواں بہت دیتی ہیں۔

اور پھر وہ چپ ہو گیا۔

نعیم احمد زبیر

فرض یابت

کراچی کا موسم اس دن صبح سے ہی خوشگوار تھا۔

رافع ڈاکٹرز روم میں بیٹھا شیشے میں اپنا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ شیشے میں دیکھنا اس کی بچپن کی عادت تھی۔ اس طرح وہ شاید اپنی تنہائی کا مداوا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ دوستی کے خواہاں تو بہت تھے لیکن اس کے خیالات سے کوئی بھی متفق نہ تھا۔

ڈاکٹر رافع کسی گہری سوچ میں تھا کہ ڈاکٹر انور دروازے کا پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوا۔

"ارے تم صبح سے کہاں تھے میں تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گیا۔ ڈاکٹر رافع نے انور کو پوچھا۔

"یار وہ ایک سابق مریضہ ملنے آئی ہوئی تھی۔" انور نے روایتی انداز میں لڑکیوں کا قصہ چھیڑ دیا۔

"لیکن کیوں؟"

"پہلے دل کی مریضہ تھی اور اب ہماری"

"ہاں یار تم بھی کسی بیماری سے کم نہیں ہو۔"

"واقعی" ڈاکٹر انور نے ایسے پوچھا جیسے کسی کو ترقی مل جائے تو پہلے پہل اس کو یقین نہیں آتا۔

"شرم تو نہیں آئی" رافع نے ایک اور طنز کی۔

"شرم اور میں۔ دو متضاد چیزیں ہیں" انور نے مزید ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔

"لیکن کبھی کبھی شرم کر لینے میں کوئی ہرج نہیں" رافع بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔

اس بحث میں دونوں بھول گئے کہ انہیں کس موضوع پر بات کرنی تھی۔ کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ آخر ڈاکٹر انور نے سکوت کو توڑا۔

"ڈاکٹر زاہد صاحب کے کمرے میں کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

"یار وہ کچھ دنوں کے لئے لاہور جا رہے ہیں۔ اپنی ایک مریضہ کی نگرانی کے لئے کہہ گئے ہیں۔ اچھا یاد دلایا۔ چلو ذرا چل کر دیکھ لیں۔"

"سسٹر ذرا ۵۴ نمبر والی مریضہ کی ہسٹری شیٹ دکھانا۔" ڈاکٹر رافع نے کہا۔ "یہ لیجیے۔" عابدہ نے شیٹ ڈاکٹر رافع کی طرف بڑھا دی۔

بلی ربن کا نسینٹریشن 7.2 اور ٹمپریچر......" ڈاکٹر رافع کی نظریں ہسٹری شیٹ پر رہیں اور ڈاکٹر انور نے راحیلہ کو ان فوکس رکھا۔ راحیلہ دونوں سے بے خبر ڈاکٹر کو تکے جا رہی تھی۔ ہسٹری شیٹ پر سے نظریں ہٹا کر رافع نے ایک نظر راحیلہ کی طرف دیکھا۔ راحیلہ کا پیلا پیلا سا اجڑا ہوا چہرہ دیکھ کر ڈاکٹر رافع کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہو گئے لیکن چھریرے بدن اور لوٹے سے قد اور تیکھے نقوش والا ڈاکٹر انور پتہ نہیں کس سوچ میں تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد دونوں ڈاکٹر ہارٹ وارڈ کے قریب سے گزر رہے تھے۔

"جانڈس نے لڑکی کا ستیاناس کر دیا ہے"

"ہاں" انور نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "کھنڈر بتا رہے ہیں کہ عمارت حسین تھی۔"

"ایسی باتیں کر کے میرا دل نہ جلایا کرو" انور رافع نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"تمہارا دل جلتا ہے اور ہماری روح کو تازگی ملتی ہے" انور نے ترکی بہ ترکی جواب دیا

"کسی وقت تو مذاق چھوڑ دیا کرو"

"ذرا اپنی آنکھیں دکھائیے" ڈاکٹر رافع نے راحیلہ سے کہا۔

"جی!" راحیلہ حیرانی سے ڈاکٹر کا چہرہ تکنے لگی۔

"جانڈس میں آنکھوں کا معائنہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔"

"دیکھئے"۔ راحیلہ نے اپنا چہرہ آگے کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر کے ہاتھ آگے بڑھے لیکن ذرا لرزش کے ساتھ۔

اس رات ڈاکٹر رافع اور راحیلہ کو نیند معمول سے ذرا دیر بعد آئی۔

"سناؤ تمہاری اس چہیتی مریضہ کا کیا حال ہے"؟ ڈاکٹر انور نے رافع کا موڈ اچھا دیکھ کر کہا۔

"اب میں تمہیں کیا جواب دوں"۔ رافع کا موڈ یک دم آف ہو گیا۔

"ویسے آج کل نرسوں کی رپورٹس کافی تعداد میں مل رہی ہیں۔

"سب بکتی ہیں" وہ ایک دم دھاڑا "سب جھوٹ ہے"۔

"تو پھر کل اس کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کیا لڑا رہے تھے"۔

"اس کے لواحقین اس سے ملنے نہیں آتے۔ کہتے ہیں متعدی بیماری ہے ہم بیماری سیٹرنے نہیں آسکتے۔ ایک ماں ہے جو گھر پہ خود بیمار پڑی ہے۔"

"کیا بات ہے آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں" ڈاکٹر رافع نے راحیلہ سے پوچھا۔

"جی... وجہ تو آپ جانتے ہی ہیں ہر وقت گھر کی فکر ستاتی رہتی ہے"

"زندگی اور دکھوں کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے ان سے دل چرانا بھی نہیں چاہئے اور نہ ہی انہیں دل پہ لگانا چاہئے"۔

"اور کتنے دن رہنا پڑے گا یہاں" راحیلہ نے شرمندہ ہو کر بات بدلی۔

"پندرہ دن!!!" راحیلہ پھر پریشان ہو گئی۔

"آپ پریشان کیوں ہو گئیں"۔

"پھر تو میری تنخواہ ماری جائے گی"۔

"تنخواہ کی فکر مت کیجئے"۔

"یہ تو آپ کہہ سکتے ہیں میں نہیں"۔

"آپ کو تنخواہ مل جائے گی"۔

ڈاکٹر صاحب آپ کا شکریہ لیکن میں آپ کی مدد قبول نہ کروں گی

"کیوں؟"

"میرا آپ کا کونسا رشتہ ہے؟"

"انسانیت کا۔ جو ہر انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ ہوتا ہے"۔

"یہ تو کوئی رشتہ نہ ہوا" راحیلہ نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا۔

"آپ کے کتنے رشتہ دار ہیں"۔

"سب ہی"

"کتنوں کو اپنا رشتہ یاد ہے"۔ راحیلہ سوچ میں پڑ گئی۔

"محترمہ رشتہ سب سے بڑا تعلقات کا ہوتا ہے"۔

"تعلقات کا" راحیلہ ڈاکٹر رافع کے جانے کے کافی دیر بعد تک ان دو لفظوں پر غور کرتی رہی

ادھر ڈاکٹر رافع اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ آخر کار وہ یہ ماننے پہ مجبور ہو گیا کہ اگر محبت کوئی جذبہ ہے تو وہ اس پر غالب آ چکا ہے۔ اور پھر وہ سو گیا۔

ڈاکٹر رافع پُروقار چال سے وارڈ میں داخل ہوا۔

راحیلہ ایک مریضہ کو پانی پلا رہی تھی۔

ڈاکٹر رافع کے چہرے پر ایک انوکھی قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی یکایک راحیلہ کی نظر اس پر پڑی۔ رافع واپس مڑا اور وارڈ سے باہر آگیا۔

"جب مریض بستر سے غائب رہنے لگے تو اس کو چلتا کرنے کے دن آجاتے ہیں" اس کو ایک سینئر ڈاکٹر کا یہ فقرا یاد آگیا۔ وہ مسکرا دیا۔

پھر وہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔

راحیلہ نے اس کی مسکراہٹ کا بالکل غلط مطلب لیا۔

" گھر جاکر بھی آرام کیجئے گا۔ علاج سے زیادہ پرہیز کی ضرورت ہوتی ہے"
رافع نے راحیلہ کو چھٹی دیتے وقت نصیحت کی۔

" اور یہ لیجئے اپنی تنخواہ"

" نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب آپ نے تو پہلے ہی میرے لئے بہت تکلیف اٹھائی ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

" وہ تو میرا فرض تھا اور یہ ہمدردی"

سرخ و سفید راحیلہ کو دیکھ کر ڈاکٹر رافع بہت خوش ہو رہا تھا۔ اس کی حالت اس وقت ایسی ہی تھی جیسی کسی باغ کے مالک کی اس وقت ہوتی ہے۔ جب بہار آنے پر خزاں رسیدہ پودوں پر نئی کونپلیں کھلتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب آپ سے کل والی مریضہ ملنے آئی ہے" وارڈ بوائے نے ڈاکٹر رافع کو اطلاع دی۔

" اندر بھیج دو" ڈاکٹر نے کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

" السلام علیکم" راحیلہ نے برقعے کا نقاب الٹتے ہوئے شوخی سے کہا۔

" وعلیکم السلام" رافع بڑی خوش خلقی سے پیش آیا" بیٹھئے" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا

" اب کیسی طبیعت ہے آپ کی" راحیلہ کو خاموش دیکھ کر بات شروع کی۔

" اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یونہی دل چاہا آپ کو ملنے چلی آئی۔

" گھر والوں سے پوچھ کر آئی ہیں" ڈاکٹر رافع نے سٹیتھسکوپ لگائے بغیر اس کے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کر لیا۔ اس کے سامنے آج پھر ایک مریضہ آگئی تھی جس کے مرض کو سمجھتا تھا لیکن علاج نہ جانتا تھا

" فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں" رافع نے الفاظ تھوڑے سے اکھڑپن کو بھی شامل کر لیا۔

" ڈاکٹر صاحب میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"۔ راحیلہ کے کپکپاتے ہونٹوں سے یہ بات بڑی مشکل سے نکلی۔

" مس راحیلہ۔ آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں" ڈاکٹر نے دل پر پتھر رکھ کر یہ بات کہی۔

" ڈاکٹر صاحب آپ واقعی یہ بات دل سے کہہ رہے ہیں"

" جی ہاں"

میں نہیں مان سکتی جو جذبہ میرے دل میں جاگ چکا ہے اس نے آپ کے دل پر اثر نہ کیا ہو۔

محترمہ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ اور ڈاکٹر کو جذبات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اگر میرا رویہ آپ سے مشفقانہ تھا تو اس سے آپ کو کوئی غلط مطلب نہ لینا چاہئے تھا

" میری وجہ سے اگر آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہو تو اس کا مجھے افسوس ہے میں آپ کے جذبات کا گلا گھونٹنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا اگر میرا رویہ آپ کے ساتھ درشت تھا تو مجھے مجبور سمجھ کر معاف کر دیجئے گا۔ بعض کام آدمی چاہتے ہوئے بھی اور کر سکتے ہوئے بھی نہیں کر سکتا... اس وقت مجھے وارڈ میں جانا ہے اس لئے اجازت چاہوں گا۔"

" اچھا ڈاکٹر میں تو چلتی ہوں لیکن چین آپ کو بھی نہیں آئے گا"
راحیلہ اتنا کہہ کر آنسوؤں سے لبریز آنکھیں لئے اٹھ کر کمرے سے نکل آئی
ڈاکٹر رافع کی پیشانی عرق آلودہ ہو گئی۔ اس نے اپنا سر کرسی کی پشت پر لٹکا دیا۔

" ڈاکٹر آپ کو بھی چین نہیں آئے گا"

اس کے کانوں میں یہ فقرہ بار بار گونج رہا تھا

" ڈاکٹر کو تو چین آ بھی گیا" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا

یکایک اسے اپنے گالوں پر کوئی سیال چیز بہتی ہوئی محسوس ہوئی ... [illegible] آنسو اس کے ہاتھ پر گرے تو گویا اسے ہوش آ گیا [illegible] ہی بجے تھے لیکن وہ بری طرح تھکاوٹ محسوس کر [illegible]

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر رافع کوریڈور میں جا رہا تھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے [illegible] اکھڑی ہوئی چال سے۔ جیسے جسم بوجھ [illegible]

وارڈ [illegible] اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ نمودار ہوئی

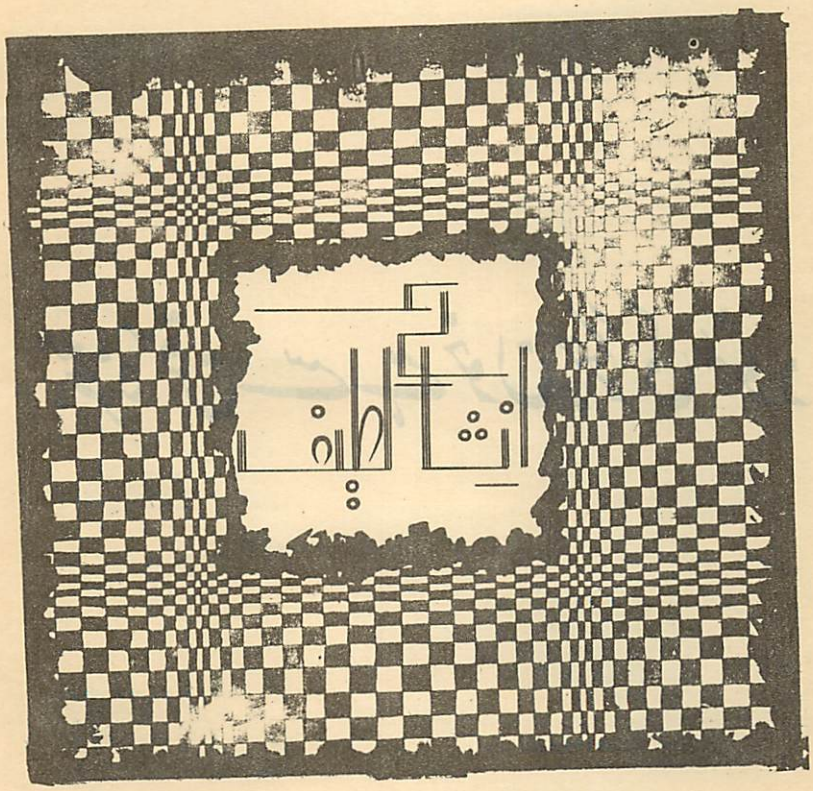
انشاء الطلب

سیدھی راہ

معجزۂ فن سے ہے خون جگر کی نمود

بے وقعت ضمیر

مشکور حسین یاد
صداقت علی چوہدری
نسرین قریشی

مشکور حسین یاد

صحیح معنی میں سفر کا شوق رکھنے والے سیدھی راہ کبھی اختیار نہیں کرتے بقول شخصے سیدھی راہ چلنے کا سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ انسان بہت جلد اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے اور وہاں پہنچکر اسے سخت بوریت ہوتی ہے منزل کے اشتیاق میں سفر کی تکلیفیں برداشت کرنا منزل پر پہنچ کر بور ہونے سے کہیں بہتر ہے کہتے ہیں سیدھی راہ چلا عموماً آدمی کو لہو کا بیل بن جاتا ہے

اندھوں کے لئے ہر راہ سیدھی ہے آنکھ والوں کے لئے کوئی راہ سیدھی نہیں سیدھی راہ عموماً مانگے کی چیز ہوتی ہے اور آنکھ والے کبھی ہاتھ نہیں پھیلاتے (جس نے ہاتھ پھیلا دیا اسے آنکھ والا نہ سمجھو) اندھے پن کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ چلنے کو سیدھی راہ مل جاتی ہے

سیدھی راہ چلنے والے اکثر منزل کی حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں ٹیڑھی راہ وہ اختیار کرتا ہے جس کے سامنے کوئی منزل نہیں ہوتی (ٹیڑھی راہ چلنا اور گمراہ ہونا ایک ہی چیز نہیں ہے) مانگے کی سیدھی راہ پر چلنے کے لئے اصول بنانے کی ضرورت پیش نہیں آتی آہستہ چلو یا تیز تھکن دونوں صورتوں میں ہوتی ہے بہت سے راہی اسی تھکن کو منزل سمجھکر پاؤں پسار دیتے ہیں

سیدھی راہ اکثر بنی بنائی مل جاتی ہے تلاش نہیں کی جاتی۔ ٹیڑھی راہ تلاش کا نتیجہ ہوتی ہے بنی بنائی نہیں ملتی ذوق جستجو نہ ہو تو انسان کبھی ٹیڑھی راہ نہ چلے جب تک منزل سامنے نہیں ہوتی آدمی ٹیڑھی راہ چلتا ہے منزل نظر آجائے تو ٹیڑھی راہیں بھی سیدھی ہو جاتی ہیں

ہر منزل کے لئے ایک سیدھی راہ ہوتی ہے اس لئے سیدھی راہ دوزخ میں بھی لے جا سکتی ہے اور جنت میں بھی منزل اگر دوزخ ہے اور مسافر آس کی بھڑکتی ہوئی آگ کو دور سے ہجوم شعلہ رخاں سمجھ رہا ہے تو ایسی صورت

ہیں ٹیڑھی راہ نعمت غیر مترقبہ سے کم ثابت نہیں ہوتی مسافر کو منزل تک لے آنے کی بجائے وہ اسے منزل کے تصور ہی میں مگن رکھتی ہے اور یوں اس کی جان بچنے کا سامان ہو جاتا ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ جب سامنے بدی کی منزل ہوتی ہے تو انسان ٹیڑھی راہ ہرگز اختیار نہیں کرتا اس کا پہلا قدم ہی سیدھی راہ پر پڑتا ہے ٹیڑھی راہیں تو نیکی کی منزلوں کے مقدر میں لکھی گئی ہیں اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ٹیڑھی راہ چلنا بہت آسان ہے اور سیدھی راہ چلنا سخت کٹھن ٹیڑھی راہ چلتے ہوئے انسان اپنی جان پر کسی قسم کا بار محسوس نہیں کرتا سیدھی راہ پر قدم رکھتے ہی بے ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑتا ہے

کا خیال پیچ و خم کی الجھنیں یہ تمام چیزیں اسی وقت تک ہوتی ہیں جب تک آدمی سیدھی راہ اختیار نہیں کرتا اس راہ میں اٹھا ہوا ہر قدم یقین کی بے حساب دولت ساتھ لاتا ہے ویسے یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ سیدھی اور ٹیڑھی راہوں کے مخمصے میں عموماً وہ لوگ زیادہ پڑتے ہیں جنہیں چلنا نہیں آتا

منزل کو دل سے فراموش نہ کر دیا گیا ہو تو بھٹکنے والے کو یہ خود بخود پکار لیا کرتی ہے گمراہی سے زیادہ درماندگی سے ڈرنے کی ضرورت ہے انسان کو گمراہ تو منزل پر پہنچنے کا حد سے بڑھا ہوا شوق بھی کر سکتا ہے لیکن درماندگی کا سبب کمی شوق یا فقدان شوق کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا مسافروں کو راہوں

کون ہے جو سیدھی راہ اختیار کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اس راہ پر قدم رکھتے ہی شدت کے ساتھ تنہائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ایسی تنہائی جس کی پیٹ میں پوری کائنات ہوتی ہے۔

سیدھی راہ چلنے والے کو کبھی نیند نہیں آتی نیند آ جائے تو نہ منزل رہتی ہے اور نہ راہ دونوں سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں ویسے راہ سے بھٹک جانا ایسی کوئی خطرے کی بات نہیں بعض اوقات یہ ایک نیک فال ثابت ہوتی ہے

جس نے سیدھی راہ پر قدم رکھ دیا سمجھ لیجئے اس نے منزل کو پالیا۔ سفر کی فکر راہوں کے خطرے ٹھکانے پر پہنچنے

کے خطرے بہت کم ہلاک کیا کرتے ہیں ان کی موت کی اصل وجہ یہی شوق کی کمی یا اس کا فقدان ہوتا ہے

راہ ٹیڑھی ہو یا سیدھی اگر اس پر بار بار چلنا پڑے تو انسان اکتا جاتا ہے چنانچہ اصل سیدھی راہ وہ ہے جس پر چل کر جی نہ اکتائے کہتے ہیں سیدھی راہ پر کوئی قدم دوبارہ نہیں اٹھتا ہر قدم ایک نئے فاصلے اور نئی منزل کو طے کرتا

ہوا آگے بڑھتا ہے سیدھی راہ جدتوں اور ندرتوں سے مالا مال رہتی ہے

ویسے تو سیدھی راہ تیر کی طرح جاتی ہے لیکن چلنے والے کو یوں محسوس ہوتا رہتا ہے جیسے گام گام پر پیچ و خم آ رہے ہیں وہ راہ سیدھی کیا ہو سکتی ہے جس پر چلتے ہوئے ہر وقت منہ کے بل گرنے کا احساس دامنگیر نہ رہے؟ ٹھوکریں کھائے بغیر آدمی کو عقل تو آ سکتی ہے لیکن عقل سے کام لینا ٹھوکریں کھا کر ہی آتا ہے ہوش و حواس ٹھکانے نہ ہوں تو سیدھی راہ پر ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا سیدھی راہ کو بال سے باریک اور تلوار سے تیز اسی لئے کہا گیا ہے کہ اس پر چلنے کے لئے بڑے متوازن دل و دماغ کی ضرورت ہے

سفر کی ساری گہما گہمی اور چہل پہل منزل کے دم قدم سے ہے لیکن منزل ہمیشہ مسافر سے دور بھاگتی ہے انسانی زندگی ہزار حدوں کے باوجود لامحدود ہے نیکی کی کوئی منزل نہیں ہے کیونکہ نیکی کی کوئی حد نہیں ہے بدی چونکہ محدود ہے اس لئے اس کی منزلیں بھی بہت جس قدم پر چاہو منزل بنا کر بیٹھ جاؤ بدی کی راہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے نیکی کی راہ کبھی ختم نہیں ہوتی اس پر چلنا چاہیے تو آدمی مسلسل چل سکتا ہے یہاں تھکن مسافر کو بٹھاتی نہیں اس کی رفتار میں تیزی پیدا کرتی ہے اس راہ میں کوئی جس قدر تھکتا ہے اسی قدر سرعت کے ساتھ اسکے قدم منزل کی طرف بڑھتے ہیں،

کون ہے جو سیدھی راہ اختیار کرنا نہیں چاہتا لیکن اس پر قدم رکھتے ہی شدت کے ساتھ تنہائی کا احساس ہوتا ہے ایسی تنہائی کا احساس جس کی لپیٹ میں پوری کائنات ہوتی ہے آج تک کسی نے دو مسافروں کو سیدھی راہ پر قدم ملا کر چلتے ہوئے نہیں دیکھا یہاں انسان کو اول سے لیکر آخر تک (اگر کوئی آخر ہے) تنہا سفر کرنا پڑتا ہے،

تنہائی کی وجہ یہ ہے کہ سیدھی راہ کا آغاز انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے سیدھی راہ انسان کی ذات سے شروع ہوتی ہے اور پھر تمام کائنات کا سینہ چیرتی ہوئی اس کی ذات میں آ ملتی ہے (یہ واضح رہے کہ سیدھی راہ دائرہ نہیں بناتی) سیدھی راہ کوئی راہ نہیں ہے یہ تو ایک منزل ہے ایسی منزل جو ہر لمحہ آگے بڑھتی ہے اور مسافر اس کے تعاقب میں لگاتار چلتا رہتا ہے،

یاد رکھو

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن جبکہ میں آپؐ کے پیچھے سواری پر بیٹھا تھا، آپؐ نے فرمایا۔

(اے لڑکے! میں تجھے چند باتیں بتاتا ہوں (غور سے سن!)

★ ــــ دیکھ تو خدا کو یاد رکھ! خدا تجھے یاد رکھے گا۔

★ ــــ تو خدا کو یاد رکھ، تو خدا کو اپنے سامنے پائے گا۔

★ ــــ جب مانگے تو خدا سے مانگ

★ ــــ جب تو کسی مشکل میں مدد کا طالب ہو تو خدا سے مدد طلب کر، خدا کو اپنا مددگار بنا۔

★ ــــ اس بات پر یقین کر کہ لوگ متحدہ طور پر تجھے کوئی نفع پہنچانا چاہیں تو وہ تجھے نفع نہیں پہنچا سکتے سوائے اس کے جو اللہ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے

اور

★ ــــ اگر لوگ اکٹھے ہو کر تجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو وہ کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، سوائے اس کے جو اللہ نے تیرے لئے مقدر کر دیا ہے

قلم رکھ دیئے گئے اور سیاہی خشک کر دی گئی

معجزہ فن کی خون جگر سے نمود

نسرین قریشی

انسانی زندگی میں جانکاہ مصائب، دل گداز تکالیف اور ناقابل برداشت مصیبتیں لازمۂ حیات کی حیثیت رکھتی ہیں یہ آلام و مصائب اور آرزوؤں کی پامالی حساس ذہنوں پر بے اطمینانی کا رنگ بکھیر دیتی ہیں اور درحقیقت یہی بے اطمینانی کا احساس اور ناتمام آرزوؤں کا پیدا کردہ سوز نہاں ہی وہ تخلیقی قوتیں ہیں جو ادیب مفکر مصور اور شاعر جیسے فنکاروں کو جنم دیتی ہیں اور جس طرح سونا بھٹی میں تپ کر کندن بن جاتا ہے شیشے کی ضرب پہاڑوں سے ندیاں بہالاتی ہے اسی طرح حالات کے تھپیڑے سہہ کر ہی انسان کی صلاحیتوں کے جوہر کھلتے ہیں۔

روح کی بالیدگی اور فکر کی بلندی اہل نظر ہی کا حصہ ہے اور یہ نظر بڑے ریاض کے بعد حاصل ہوتی ہے ایک سچا فنکار زندگی کو اپنی نگاہوں سے دیکھتا ہے اس کی نگاہ میں وہ وسعت وہ عمق اور وہ گہرائی ہوتی ہے کہ وہ ساری کائنات کا احاطہ بڑی آسانی سے کرلیتا ہے اور ان کی مشترک قدروں کو منتخب کرکے اس ماہرانہ فنکاری کے ساتھ اس کی عکاسی کرتا ہے کہ اس کے فن پارے زندگی کی آفاقی قدروں سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں ان میں جذبات کا انعکاس ہوتا ہے احساسات کی تندو تیز آنچ ہوتی ہے اور ناتمام آرزوؤں کا عکس ہوتا ہے۔

ایک فنکار زندگی کے تمام مسائل کو فلسفیانہ اور ناقدانہ نگاہوں سے دیکھتا ہے اور تخیل کے بجائے تجربے اور مشاہدے کا سہارا لے کر زندگی اور زندگی سے متعلق تمام تلخیاں بڑی سچائی اور صداقت کے ساتھ بیان کرتا ہے اور درحقیقت یہی فن اور فنکار کی معراج ہے۔ فنکار اپنے فن کے سہارے درحقیقت اپنی شخصیت کی تکمیل کرتا ہے جب زندگی کے ہنگامے اس کی حساس طبیعت پر اثر انداز ہوتے ہیں تو دریائے فن کی گہرائیوں میں ڈوب کر ہی وہ اپنے درد کا درماں اور اپنی بے چین روح کے لئے تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے جس کے نتیجے میں ایک عظیم شاہکار کی تخلیق ہوتی ہے ایک کامیاب فنکار وہی کہا جاسکتا ہے جو نکتہ رس دماغ اور قلب کی گہرائیوں تک پہنچنے والی نظر رکھتا ہو۔ اور فن کی راہ میں اپنے آرام و آسائش کو بھی بھینٹ چڑھا سکے۔ ایک فنکار ہی انسان کے گہرے احساسات اور عمیق جذبات تک آسانی سے رسائی حاصل کرلیتا ہے یہاں تک کہ فن کے پردے میں وہ کائنات

کی بعض پیچیدہ اور گہری حقیقتوں کو بیان کر جاتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قدرت کے سربستہ رازوں سے بھی بخوبی واقف و آگاہ ہے۔

فن اسی وقت صحیح معنوں میں فن ہے جب وہ صرف دیکھنے اور سننے کے لئے نہ ہو بلکہ اس میں مسائل حیات کا دلکش اظہار ہو وہ نہ صرف ذہن کو جلا بخشے بلکہ روح کی بالیدگی بھی کر سکے اس لئے کہ انسانی ارتقاء کا مقصد صرف مادی ترقی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد انسان کی ترقی بحیثیت اشرف المخلوقات کے ہے جس کے لئے فکر کی بلندی اور روحانی ارتقاء کی ضرورت ہے فن دراصل انسانی ارتقاء کی منزل تک پہنچنے کا راستہ ہے اور فنکار اس منزل تک پہنچنے کے لئے ایک رہبر ایک رہنما کی حیثیت رکھتا ہے تاریخ کے صفحات پلٹ کر دیکھیں اور ماضی کی داستانوں کو دوہرائیں تو یہ پتہ چلے گا کہ انسان نے جب بھی اور جہاں بھی اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑے تو محض اپنے فن اور صلاحیتوں کی بدولت

وقت کے اس سیل رواں

نے انسانی ترقی کے بہت سے روپ دیکھے ہیں مختلف حالات میں مختلف لوگوں نے مختلف انداز میں زمانے سے انسانی عظمت کا لوہا منوایا اس سرزمین پر کتنے مفکر، کتنے فلسفی، کتنے شاعر اور کتنے مصور اپنے ذہنوں کے اجالے بکھیر گئے لوگ مانی اور بہزاد کو اب بھی فراموش نہیں کر سکتے، اقبال، گوئٹے اور نطشے کے فلسفے کو حیات کا ماخذ سمجھتے ہیں کتنے فنکاروں کے فن پارے آج بھی عظیم شاہکار تصور کئے جاتے ہیں کتنے شاعروں کا کلام آج بھی سوئے ہوئے قلب و نظر میں جادو جگاتا ہے کتنے فنکاروں کا فن اب بھی انسانی ترقی کی بلند ترین منازل کی نشاندہی کرتا ہے غرض یہ کہ موسیقی ہو یا شاعری مصوری ہو یا کوئی اور تخلیقی کوشش وہ اسی وقت معراج کمال کو پہنچتی ہے جب اس فن کا خالق جو کہ خود بھی خالق کائنات کا شاہکار ہے پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ صحیح معنوں میں جذبات انسانی اور احساسات روحانی کی ترجمانی کرے اپنے شاہکار میں تخیل کا رنگ نہ بھرے بلکہ زندگی کی صداقتوں کی تفسیر و تشریح بیان کرے فن معجزے کی صورت اسی وقت اختیار کر سکتا ہے جب کسی فنکارانہ تخلیق کو سنئے، دیکھئے یا پڑھنے کے بعد وہی جذبہ لوگوں کے دلوں میں بیدار ہو جائے جو فنکار کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں دفن تھا۔ فنکار اگر سوز نہاں کو عیاں کرنا ہی چاہتا ہے تو اس موثر انداز سے کرے جس سے یہ اندازہ ہو اور یہ اثر مرتب ہو کہ غم میں کتنی رفعت، آلام و مصائب میں کتنی عظمت ہے خواہ اس تخلیقی کوشش کے بعد خود فنکار یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ

دل میرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا
آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

فن جب ہی عروج پا سکتا ہے جب جذبات و احساسات کی تندو تیز آنچ دے کر ناتمام آرزوں اور تمناؤں کے لہو سے اس کی آبیاری کی جائے کہ یہی قانون قدرت بھی ہے نہ جانے کتنے لالہ و گل کا سینہ چاک ہوتا ہے تب کہیں بہاروں کے پیرہن مہکتے ہیں اور کتنے ستاروں کا خون ہوتا ہے تب کہیں جا کر صبح کی تخلیق ہوتی ہے۔

★★

اللہ کی پناہ

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ
مِنْ قَلْبٍ لَّا یَخْشَعُ
وَنَفْسٍ لَّا تَشْبَعُ
وَعِلْمٍ لَّا یَنْفَعُ
وَدَعْوَۃٍ لَّا یُسْتَجَابُ بِھَا

اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں
• اس دل سے جس میں خوف نہ ہو
• اس نفس سے جو سیر نہ ہو
• اس علم سے جو سود مند نہ ہو
اور
• اس دعا سے جو مقبول نہ ہو

(حدیث)

بے وقت ضمیر

صداقت علی چودھری

آج عید کا روز ہے۔ عید بھی بڑی والی۔ آپ جانیں اس عید کے ساتھ کھال کا ذکر ضرور آتا ہے۔ گوشت کی تو اس دن زیادہ مانگ نہیں ہوتی لیکن کھال کے چرچے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ صبح سے لے کر شام تک ریڈیو پر بار بار، رک رک کر اٹک اٹک کر اور جھٹک جھٹک کر اعلانات ہوتے ہیں کہ بکرے کی کھالیں صرف ماہر قصاب اتاریں اور اناڑی حضرات یہ تکلیف نہ فرمائیں۔ کیونکہ اس طرح کھال کے ضائع ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔

ریڈیو والوں سے کوئی پوچھے، آخر آپ ملکی حضرات ملکی حالات سے اس قدر بے خبر کیوں ہیں۔ عوام پر اس حد تک بے اعتمادی ان کی ناراضی مول لینے کے مترادف ہے ہمارے ملک میں تو ہر کوئی کھال اتارنے میں ماہر ہے۔ اور اس فن میں نئے نئے انداز اختیار کرنے کا سہرا بھی ہمارے ہی خواص و عام کے سر بندھتا ہے۔

کھال کئی قسم کی ہوتی ہے لیکن ہر کھال میں ایک خصوصیت مشترک ہوتی ہے۔ وہ ہے حفاظت کرنا اور کھال اگر دوسرے کی ہو تو تحفظ کا احساس شدید ہوتا ہے بٹیر سے لے کر اونٹ تک کی کھال فائدہ مند ہے۔ اگر بٹیر کی کھال نہ ہوتی تو بٹیر لڑانے میں بہت مشکل پیش آتی۔ اور اس طرح دنیا ایک دلچسپ اور مفید مشغلے سے محروم رہتی ہاں پھر یہ کھیل امارت کی نشانی بن جاتا۔ یار لوگ طعنے دیا کرتے کہ ہاں یار آج کل تو اونچی ہواؤں میں ہو۔ بٹیر لڑا رہے ہو ہمیں کہاں پوچھتے ہو اس مقصد کے لئے بٹیروں کو مصنوعی کھالیں پہنائی جایا کرتیں

کہا جاتا ہے کہ مرغی میں سب سے لذیذ چیز اس کی کھال ہوتی ہے۔ بتائیے بھلا اگر مرغی کی کھال نہ ہوتی تو

اس میں سب سے لذیذ چیز کونسی ہوتی۔ ممکن ہے ہوتی ہی نہ۔ اور پھر اس قسم کے فیصلوں میں کس قدر جھگڑے ہوتے۔ بہت ممکن ہے مرغی ہی فتوی جاری کر دیتی کہ مسئولات کے متعلق آپ کسی قسم کا فیصلہ جاری نہیں کر سکتے۔

بکری اور گائے کی کھال کے بھی بہت فوائد ہیں۔ مضبوطی میں اس کا جواب نہیں۔ اس کھال سے بنی ہوئی جوتیوں میں دال بڑی اچھی طرح بٹتی ہے اور اس طرح یہ کھال جوتیاں چٹخانے والوں اور سڑکیں ناپنے والوں کے بہت کام آتی ہے۔ اگر یہ کھال نہ ہوتی تو عاشق حضرات کو بہت مایوسی ہوتی۔ خودکشی کی وارداتوں میں اضافہ ہو جاتا۔ بچوں کے بجائے بڑوں کے اغوا بڑھ جاتے۔

کھالوں کی مزید تین قسمیں بھی ہیں۔

وہ کھال جو اتروانے والے کی مرضی سے اتاری جائے۔

وہ کھال جو اتروانے والے کی مرضی کے خلاف اتاری جائے۔

وہ کھال جس میں اتروانے والے یا اتارنے والے کی مرضی کو کوئی دخل نہیں ہو۔

امیر لوگ اپنی مرضی سے کھال اتروا تے ہیں اور وہ بھی باقاعدہ وقفوں کے ساتھ۔ طرہ یہ کہ بڑی خوشی سے۔ فخریہ انداز میں۔ شاید اس لئے بھی کہ ان کی کھالیں ہوتی ہی ناکارہ ہیں یا شاید ان کے پاس کچھ ایکسٹرا کھالیں بھی ہوتی ہیں۔ بہرحال اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ اپنی کھال کی زیادہ CARE نہیں کرتے (میری مراد اس "CARE" سے نہیں جو میک اپ کے سامان سے کی جاتی ہے)

غریب کی کھال زبردستی اتاری جاتی ہے گو یہ پتلی ہوتی ہے لیکن معیاری۔ غریب لوگ کھال اتروانے میں بہت اڑی کرتے ہیں۔ لہذا خاصی دقت پیش آتی ہے۔ اکثر اسی کھینچا تانی میں کھال کا حلیہ بگڑ جاتا ہے پھر بھی کھال کے سلسلے میں غریب کی کھال کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ایک تو یہ ملتی وافر مقدار میں ہے دوسرے ہوتی بہت اعلیٰ قسم کی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ جوں جوں اس قسم کی کھالوں کی بہتات ہوتی جا رہی ہے اس کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ غریبوں سے میری درخواست ہے کہ وہ کھال اتروانے میں زیادہ پس و پیش نہ کیا کریں۔ ہاں دام چڑھانے چاہیں تو چڑھا سکتے ہیں۔

تیسری قسم میں اتارنے اور اتروانے والے کے علم میں یہ عمل ہوتا ہی نہیں۔ شاعروں کی کھال محض داد دے کر اتاری جا سکتی ہے۔

کھال اتارنا ایک فن ہے
اور اتارنے والا فنکار
کچھ اس فن میں ثانی نہیں رکھتے
کچھ سوسو ہوتے ہیں اور کچھ اناڑی

ادیبوں کی کھال

محض ان کی تخلیقات کی تعریف کر کے اتاری جا سکتی ہے۔

ہڑتالیں کروا کے اتاری جا سکتی ہے۔ عوام کی کھال انہی سے کھٹے میٹھے نعرے لگوا کر اتاری جا سکتی ہے۔

سیاستدانوں کی کھال ان سے ووٹ کی قیمت وصول کر کے اور ووٹ نہ دیکر اتاری جا سکتی ہے

کھال اتارنا ایک فن ہے اور اتارنے والا فنکار۔

کچھ خوش قسمت اس فن میں ثانی نہیں رکھتے۔

کچھ سوسو ہوتے ہیں۔ اور

کچھ سرے سے اناڑی۔

تیسری قسم والے حضرات اگر یہ عبارت فرمائیں تو انسان شدتِ درد سے بلبلا اٹھتا ہے۔ دوسری قسم والے

حضرات جب کھال اتارتے ہیں تو تکلیف اور لطف کے ملے جلے اثرات محسوس ہوتے ہیں۔ اور سچ جانیں پہلی قسم والے صاحبان اس پیار سے کھال اتارتے ہیں کہ پتا بھی نہیں چلتا اور ان پر غصے کی بجائے پیار آتا ہے۔

کھال اتارنا اگر فن ہے تو اس کے کچھ قواعد وضوابط ہوں گے گو کہ مقصد ایک ہی ہے۔ لیکن راہیں مختلف اختیار کی جاتی ہیں۔

چند معیار کا خاص خیال رکھتے ہیں اور صرف اعلیٰ قسم کی کھالیں اتارتے ہیں۔ ان کی نظر بلا کی تیز ہوتی ہے۔ چند توسیدھی ستاروں پر کمند ڈالتے ہیں

قصاب چھری اور گھونسے سے کھال اتارتے ہیں۔ ماہر قصاب خالی گھونسے سے بھی کھال اتار لیتے ہیں ان سے بھی ماہر ایک سوئی کی مدد سے یہ مقصد حل کر لیتے ہیں۔

چند شرارتی لوگ قینچی سے کام چلاتے ہیں۔

اس کے بعد وہ لوگ ہیں جو گرتے ہیں قتل اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں کے مصداق۔ تیغ ابرو سے کھال اتارتے ہیں کچھ لوگ نوٹ کی تیز دھار سے کھال اتارتے ہیں۔

قائداعظم والے نوٹ کی دھار سب سے تیز مانی جاتی ہے۔ قائداعظم کے رعب میں کھال ویسے بھی جلدی اترتی ہے۔

کھال اتارتے وقت چند لوگ معیار کو بالکل مدنظر نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک معیار کی بجائے مقدار زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

چند معیار کا خاص خیال رکھتے ہیں اور صرف اعلیٰ قسم کی کھالیں اتارتے ہیں۔ ان کی نظر بلا کی تیز ہوتی ہے بعض تو سیدھی ستاروں پہ کمند ڈالتے ہیں اور پھر آگے کے جہانوں کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ یہ لوگ اس فن میں یکتا کہلانے کے صحیح حقدار ہیں۔

یہ کہہ کر کھال اتارنے والوں کی بھی کمی نہیں کہ کھال اتارنا ایک برا فعل ہے۔ ان لوگوں کا دھندا زیادہ دیر چلتا ہے چاہے درمیان میں "مندا" بھی آجائے۔

بعض لوگ کھال اتارنے کو قابل مذمت قرار دیتے ہیں لیکن اس لئے یہ کام سرانجام دیتے ہیں کہ انہیں بھی کھال اتروانی ہوتی ہے یہ لوگ چھوٹی چھوٹی کھالیں اتار کر بڑی بڑی کھالیں اتروالیتے ہیں۔ کلرک اور سپاہی اسی زمرے میں آتے ہیں۔

افسر لوگ بڑی بڑی کھالیں اتار کر چھوٹی چھوٹی کھالیں اتروالیتے ہیں۔

امیر لوگ اس قدر بڑی بڑی کھالیں اتارتے ہیں کہ ان کی اتاری ہوئی کھالیں ان کی آنے والی نسلیں اتارواتی ہیں۔ ایک دو ٹکڑے پھر بھی بچ جاتے ہیں۔

بقول جناب احمد ندیم قاسمی ہماری قوم میں ایک خوبی ہے وہ یہ کہ ہم جو بھی کام کرتے ہیں من حیث القوم کرتے ہیں مثلاً اگر سنجیدہ ہو جائیں تو پوری قوم کو "چپ" لگ جاتی ہے اور اگر شوخی پر اتر آئیں تو خدا کی پناہ۔

آج پوری قوم کھال اتارنے پر لگی ہوئی ہے اور مزے کی بات یہ کہ آج ہر چیز کی قدر و قیمت چڑھ رہی ہے لیکن ضمیر کی وقعت کم ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے اس بیچارے ضمیر پر بڑا ترس آتا ہے۔

مرزا غالبؔ سے ایک ملاقات

ناصر محمود

پاچھیدا اور امپالا

عبدالقدوس

ٹھونسے چلا جاتے ہم بار اس کے اندر ... خوبیاں
کا ذکر تو ہم کر ہی چکے ہیں پہلی نظر دیکھ کر ہی ہو رہا تھا کہ یہ کار کسی
زمانے میں بڑی قیمتی ہو گی۔ آثار قدیمہ کی چیزیں ہمیشہ اپنی قیمت
سے زیادہ قیمتی تصور کی جاتی ہیں۔ رنگ کا انتخاب بھی
داد طلب تھا۔ کہ اس قسم کا رنگ ... کا سا رنگ تھا کہنا ضروری
ہے ورنہ ہم ایسے دم کٹر بلائینڈ کہلائے جاتے۔ یہ بھی ظاہر تھا
کہ پٹرول کا خرچ بھی بہت ہوگا۔ انجن چلے تو پٹرول کا خرچ ہو۔
خیر موٹر میں بیٹھے اور خدا کا کرنا یہ ہوا کہ موٹر صاحب پہلی ...
بدلنے پر اسٹارٹ ہو گئی۔ اور پھر رینگتی ہوئی آگے بھی بڑھنے لگی
اب ہم پر اس موٹر کی مزید دلکشی اور دلفریب خوبیاں منکشف
ہوئیں۔ نشستیں تو خیر جیسی تھیں گوارا تھیں مگر چھت کچھ اتنی نیچی تھی کہ
اندر بیٹھنے کے لئے ہم جیسے لمبے انسان کو کئی تہوں میں بیٹھنا پڑتا تھا
اسپیڈومیٹر کی سوئی ٹوٹ چکی تھی۔ یا توڑ دی جا چکی تھی۔ چنانچہ
رفتار کا اندازہ مختلف پرزوں اور حصوں کی ارتعاش اور لرزش
سے ہوتا تھا۔ مثلاً پندرہ میل کی رفتار پر اگلے مڈگارڈ زور و شور سے
ہلنے لگتے تھے۔ بیس میل کی رفتار پر پچھلے مڈگارڈ بھی اگلوں کا
ساتھ دینے لگتے۔ پچیس میل کی رفتار پر سٹیئرنگ وہیل کو (PARKINSONISM)
کی طرح کا لرزہ ہونے لگتا۔ اور تیس میل پر پوری گاڑی سردی
کھاتے ہوئے جانور کی طرح ہانپ کانپ جاتی تھی اس سے زیادہ
رفتار کا تجربہ نہیں ہوا۔ اور اچھا ہوا۔ کہ نہیں ہوا۔ ورنہ اس کی
تفصیل بتانے کے لئے آپ کو کسی دوسرے آدمی کی ضرورت پڑتی۔
چلتے ہوئے اس موٹر کا ہر پرزہ اور ہر حصہ حسب استطاعت
چیختا چلاتا اور شور مچاتا تھا سوائے ہارن کے میلوں دور سے
موٹر کی کھڑکھڑاہٹ اور گڑگڑاہٹ اپنے آنے کا پتہ دے دیتی تھی
نتیجتاً روتے ہوئے بچے ماں کی آغوش میں جا چھپتے تھے اور اگر نہیں
چھپتے تھے تو مائیں فوراً انہیں اپنے کلیجے سے لگا لیتی تھیں بڑے بوڑھے
قیامت کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ بعض تو اس بد ذوقی ...
کا ... تجربہ بناتے تھے۔ راہ گیر اسے مڑ مڑ کر دیکھتے اور
دیکھ دیکھ کر ... جاتے قنوطی لوگ اسے دیکھ کر عبرت پکڑتے

روک کر انہیں آگے نکلنے کا موقع دے دیتا کہ یہ جس قدر تیزی اور
جلدی سے پار کر لے اتنا ہی اچھا ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ والوں کی رال
اس پر ٹپکتی اور وہ اپنے کپڑے بے خراب کر لیتے۔ محض اس کے جوڑے
کی تلاش میں تھے۔ تاکہ اس بات کا ایک اور ثبوت مہیا کریں کہ حضرت
نوح نے ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا طوفان سے بچایا تھا۔

چلتے چلتے ڈرائیور نے بڑی پھرتی سے بریک لگایا اور کار
کے اندر بیٹھنے والوں کا آملیٹ بنا کر رکھ دیا۔ رشید صاحب اپنے
دکھتے ہوئے جوڑوں کو سہلاتے ہوئے غرائے۔ "وہ کیا ہوا تھا؟"

"جی وہ ایک گدھا تھا سامنے"

"تو بے وقوف ہارن کیوں نہیں دیا"

اس پر ڈرائیور نے انہیں ہارن کی خرابی سے آگاہ کیا
اگلے ہی روز ڈاکٹر صاحب کی موٹر کار میں تیز آواز والا اونچی نیچی
لے میں دھاڑنے والا ہارن لگ چکا تھا۔ وجہ پوچھی گئی تو فرمایا
"وہ ارے بھائی جن کو خبر نہیں ہوتی تھی گاڑی کے آنے کی۔ اب ہو
جایا کرے گی اس وجہ سے یہ کام کیا ہے"

"عرض کیا" اور فٹ پاتھ والے گھبرا کر سڑک پر اور
سڑک والے بدک کر فٹ پاتھ پر منتقل ہو جایا کریں گے"

یہ بات انہیں بہت بری لگی۔ چنانچہ مجھے یقین ہو گیا
کہ اس میں سچ کی ملاوٹ ضرور ہے۔ ڈاکٹر صاحب کافی عرصہ تک
ناراض رہے۔ ہم کچھ عرصہ تک خوش رہے۔ کہ چلو بلا ٹلی۔ مگر ہوا
یہ کہ ایک روز پھر اس سیلاب بیکراں کا رخ خاکسار کی طرف مڑ گیا
استقبال کے لئے باہر آنا پڑا کار پر نظر پڑی تو لکھا ہوا نظر آیا۔

نہ انجن کی خوبی نہ کمال ڈرائیور۔

بس خدا کے سہارے چلی جا رہی ہے،

دل کی گہرائیوں سے ایک پھیپھڑا اجاڑ قسم کا قہقہہ بلند ہوا
ہم نے رشید صاحب کے اور انہوں نے ہمارے گناہ بخش دیئے
اور یوں پلک جھپکنے میں سارے گلے شکوے دور ہو گئے۔

معلوم ہوا ڈاکٹر صاحب اپنے حلقے سے انتخاب لڑنا
چاہتے ہیں اور ہماری مدد کی تلاش ان کو ہمارے غریب خانہ پر

لے آئی تھی ۔ ہماری انتخابی مہم شروع ہوئی ۔ یکے بعد دیگرے درجنوں سیاسی جماعتوں کے دروازے کھٹکھٹاتے شروع کئے مگر کہیں سے ٹکٹ نہ مل سکا ۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب آزاد طبیعت اور بے جھجک سے آدمی تھے چنانچہ دائیں بازو والی جماعتیں انہیں بائیں بازو کا آدمی تصور کرتی تھی ۔ اور بالکل اسی کے الٹ بائیں بازو والوں کا خیال تھا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ مردِ مومن بے تیغ ہی آتش انتخابات میں کود پڑا ۔ اور آزادانہ انتخاب لڑنے کا اعلان کر دیا ۔ کار کو انتخابی النشان کے طور پر چنا گیا ۔ اور پھر گلی گلی کوچہ کوچہ آوارہ گردی شروع ہو گئی ۔

ڈاکٹر صاحب کی کار ایک عرصہ سے موضوعِ خاص و عام تھی ۔ لیکن ان کے الیکشن لڑنے کے اعلان نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا چند ہی دنوں میں ڈاکٹر صاحب شیطان اور اخباری نمائندوں سے بھی زیادہ مشہور ہو گئے ۔ جلسے کا اعلان وہ نہایت کفایت شعاری سے کرتے تھے اپنی کار کے آگے پیچھے دائیں بائیں جلسے کا وقت وغیرہ لکھ کر شہر کا ایک چکر لگا لیتے تھے کون کافر تھا ۔ جو پلٹ پلٹ کر ان کی کار کی طرف نہ دیکھتا تھا ۔ وہ کون بے مہر تھا جس نے رک رک کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کار کا دیدار نہ کیا ۔ بڑے بڑے مارے رشک کے بے ہوش ہو گئے ۔ اچھے اچھے بدحواس ہو کر اپنے آپ سے باہر ہو گئے ۔ مگر ڈاکٹر صاحب کو الیکشن لڑنا تھا ۔ سو انہوں نے کسی کی پرواہ نہ کی ۔ صرف اپنے کام سے کام رکھا ۔ کشتگان صدر کی طرف نگاہ بھی نہ کی ۔ رشید صاحب نے اپنی تقریروں میں اپنے ووٹروں سے کچھ اتنی ہی بے قراری اور خلوص سے وعدے کئے جیسے کوئی ناز بردار عاشق بے اقراری میں اپنی محبوبہ دلنواز سے کرتا ہے ۔ چنانچہ مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ مرزا صاحب اپنی انتخابی مہم میں صورت سے زیادہ کامیاب نکلے الیکشن ہوا اور حسب توقع کامیاب ہو گئے کامیاب ہونے کے بعد پہلا کام انہوں نے یہ کیا ۔ کہ ہمیں پہنچانے سے انکار کر دیا ۔ ہم تو پھر پلٹ کر بھی اس بے وفا کے پاس نہیں گئے ۔ مگر سنا ہے کہ ان کے در پر جانے والا پرانا ووٹر کبھی کامیاب واپس نہیں لوٹا اور یہ کہ ان کی نامہ روزگار کار ان کے دولت کدہ کے سامنے کھڑی رفتہ رفتہ سپیئر پارٹس میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے اور مرزا صاحب آج کل نئی امپالا میں گھومتے نظر آتے ہیں ۔

SCANNED BY OFFICES OF AMIN H. KARIM MD